معارف کا زر تعاون

ہندوستان میں سالانہ اسی روپے فی شمارہ سات روپے

پاکستان میں سالانہ دو سو روپے

دیگر ممالک میں سالانہ ہوائی ڈاک بیس پونڈ یا بتیس ڈالر

بحری ڈاک سات پونڈ یا گیارہ ڈالر

پاکستان میں ترسیل زر کا پتہ : حافظ محمد یحییٰ شیرستان بلڈنگ

بالمقابل ایس. ایم. کالج. اسٹریچن روڈ. کراچی

- سالانہ چندہ کی رقم منی آرڈر یا بینک ڈرافٹ کے ذریعہ بھیجیں. بینک ڈرافٹ درج ذیل نام سے بنوائیں،

DARULMUSANNEFIN SHIBLI ACADEMY
AZAMGARH

- رسالہ ہر ماہ کی ۱۵ تاریخ کو شائع ہوتا ہے. اگر کسی مہینے کے آخر تک رسالہ نہ پہونچے تو اس کی اطلاع اگلے ماہ کے پہلے ہفتہ کے اندر دفتر میں ضرور پہونچ جانی چاہیے اس کے بعد رسالہ بھیجنا ممکن نہ ہوگا.
- خط و کتابت کرتے وقت رسالہ کے لفافہ کے اوپر درج خریداری نمبر کا حوالہ ضرور دیں.
- معارف کی ایجنسی کم از کم پانچ پرچوں کی خریداری پر دی جائے گی.

جلد ۱۶۱ ماہ شوال المکرم ۱۴۱۸ھ مطابق ماہ فروری ۱۹۹۸ء عدد ۲

فہرست مضامین

شذرات

یہ رسالہ جس وقت قارئین کے ہاتھوں میں پہنچے گا، اس وقت ملک میں انتخابات کا پہلا مرحلہ ختم ہو چکا ہوگا، ملک کی بدقسمتی سے سیاست پر جو لوگ چھائے ہوئے ہیں ان کے ہر قسم کی بدعنوانیوں بلکہ جرائم میں بھی ملوث ہونے کا راز تو پہلے ہی مختلف طرح کے اسکینڈلوں نے فاش کر دیا تھا، اب انتخابات کے اعلان کے بعد اس پر مزید مہر تصدیق ثبت ہو گئی ہے، اس موقع پر جس بے اصولی، موقع پرستی، دل بدلی اور بدترین کردار کے مظاہرے ہوئے ہیں اس سے ملک کے شدید اخلاقی و روحانی زوال کا پتہ چلتا ہے، تمام ہی سیاسی پارٹیوں نے دل بدلوؤں کا خیر مقدم کیا اور انہیں اور جرائم پیشہ لوگوں کو ٹکٹ سے بھی نوازا، سب سے زیادہ حیرت ووٹروں پر ہوتی ہے جو اس طرح کے بے اصول، بدعنوان اور دل بدلو لوگوں کے ہاتھوں میں ملک کی باگ ڈور دیدیتے ہیں، انتخابی نتائج کا اعلان تو اگلے مہینے میں ہوگا، لیکن ملک میں اخلاق و اقدار کے زوال و تباہی کا اعلان اس سے پہلے ہی ہو گیا ہے۔

یہ سارا کھیل برسر اقتدار آنے کے لیے کھیلا جا رہا ہے اور درحقیقت مال و دولت اور جاہ و اقتدار کی بڑھی ہوئی حرص ہی اس ملک کی ساری خرابیوں کی جڑ ہے، اس کے لیے اصول، ایمانداری، کردار اور حب الوطنی سب کو داؤں پر لگا دیا گیا ہے، سب سے زیادہ بھارتیہ جنتا پارٹی گل کھلا رہی ہے، جو سب سے زیادہ اپنی اصول پسندی، پاک دامنی، بے داغ کردار اور دیش بھگتی کا ڈھنڈورا پیٹتی تھی۔ حالانکہ

بڑے پاک طینت، بڑے صاف باطن ریاض آپ کو کچھ ہمیں جانتے ہیں

ابھی اس نے اترپردیش میں برسر اقتدار آنے کے لیے جو کچھ کیا تھا اور اب مرکز میں برسر اقتدار آنے کے لیے جو کچھ کر رہی ہے، یہ تو بالکل سامنے کی بات ہے، کیا یہی اصول پسند جماعت کا شیوہ ہوتا ہے، مسلم دشمنی اس کی شناخت بن چکی ہے مگر برسر اقتدار آنے کے لیے اس نے پہلے ان کو رجھانے اور پھسلانے کی کوشش کی لیکن جب یہ بیل منڈھے نہ چڑھی اور مسلمان ان پرانے شکاریوں کے نئے جال میں نہ پھنسے علاوہ ازیں آندھی

اور طوفان بن کر نیا گاندھی کے انتخابی دنگل میں کود پڑنے سے بی۔ جے۔ پی کو ہندو ووٹ سے بھی ہاتھ دھو بیٹھنے کا اندیشہ ہوا تو اس نے پھر نہایت زور و شور سے ہندوتوا اور مسلم دشمنی کا راگ الاپنا شروع کیا۔

تضاد اور دو عملی بھی اس پارٹی کی پہچان ہے، آج کچھ، کل کچھ اور۔ ایک لیڈر جو بات کہتا ہے، دوسرا اس کی تردید کرتا ہے۔ وزارت عظمیٰ کے متمنی کل تک مسلمانوں سے ایک موقع مانگ رہے اور یہ کہہ رہے تھے کہ وہ ان سے خوف نہ کھائیں، ایک مرتبہ ان کو بھی آزمائیں، وہ انہیں تحفظ دیں گے، ان کی تعلیمی و معاشی حالت بہتر بنائیں گے، اب وہی مسلمانوں کو تہذیب سکھانے اور اس کی تلقین کرنے لگے ہیں کہ وہ کعبہ و اسلام کی طرف نگاہ نہ اٹھائیں، قرآن مجید پر جس کو سمجھ بھی نہیں سکتے الزام تراشی کر رہے ہیں، یہ زمانے کا انقلاب ہے کہ جو خود تہذیب ناآشنا ہے وہ ان مسلمانوں کو تہذیب سکھانے کی بات کہہ رہا ہے جنھوں نے اس ملک کو تہذیب و تمدن اور علم و ہنر دیکر گل و گلزار بنایا تھا، جس کے آثار اس کے چپہ چپہ پر نظر آرہے ہیں۔

ہر طرف حسن کے آثار نظر آتے ہیں مری تہذیب کے انوار نظر آتے ہیں

وزارت عظمیٰ کے ان امیدوار کو یہ بات اپنے دل سے نکالنی ہوگی کہ مسلمان ان سے یا ان کی حکومت سے خوف زدہ ہیں، وہ صرف خدا سے ڈرتے ہیں جس کے ہاتھ میں ان کی زندگی و موت ہے، جو ان کا خالق، مالک، رب اور رزاق ہے، ان کا یہ سوچا سمجھا فیصلہ ہے کہ وہ اپنے خدا اور رسول، قرآن مجید، خانۂ کعبہ اور ایمان و اسلام سے کبھی نظریں نہیں پھیر سکتے خواہ اس کا انجام کچھ ہو۔

ع جس کو ہو جان و دل عزیز اس کی گلی میں جائے کیوں

بی۔ جے۔ پی کا پلڑا اس لیے بھاری ہو گیا ہے کہ سیکولر پارٹیاں بہت منتشر ہیں، بی۔ جے۔ پی نے ان کو بڑی عیاری سے یا تو ایک دوسرے سے شدید متنفر اور بے زار کر دیا ہے جس کا تماشا ہم اترپردیش میں دیکھ رہے ہیں، یا بعض پارٹیوں ہی کو اس نے دو نیم اور بے جان کر دیا ہے، بہار، بنگال، کرناٹک اور اڑیسہ میں یہ کرتب دکھا کر وہ فخر سے کہہ رہی ہے ع میرے فتنے یم بہ یم دریا بہ دریا، جو بہ جو۔

آج جب کہ سیکولرازم اور فاشزم کی لڑائی عروج پر پہونچ گئی ہے اور ملک میں جمہوریت، قومی ایکتا اور امن و اتحاد کو بی۔ جے پی کی فرقہ پرستی نے ہرطرف سے گھیر رکھا ہے، اس کے مذہبی جنون اور ہندوتوا کی لہروں نے نفرت، تفریق اور انتشار کو پروان چڑھا کر ملک کی سلامتی کے لیے خطرہ پیدا کر دیا ہے، ایسے نازک موڑ پر بھی اگر بی۔ جے۔ پی کو روکنے والی پارٹیاں متحد نہ ہوسکیں اور انھوں نے ہوسِ اقتدار کی دلدی پر حب الوطنی اور سیکولرازم کو بھینٹ چڑھا دیا تو بی۔ جے۔ پی کے برسرِ اقتدار آنے کی ذمہ داری سے یہ اپنے آپ کو بری کیسے قرار دے سکتی ہیں؟

خود مسلمانوں کا رویہ بھی عجیب ہے جن کی مخالفت بی۔ جے۔ پی کی گھٹی میں پڑی ہوئی ہے، جس نے ان کا معبد مسمار کیا اور اب اس کا انتخابی منشور بھی اسی کا مظہر ہے، لیکن اس کے باوجود کچھ لوگ اس سے پینگیں بڑھائے ہوئے ہیں، جو لوگ اس کے معاملہ میں حساس اور اس کو خطرناک بھی سمجھتے ہیں وہ بھی حکمتِ عملی، دوراندیشی اور تدبر سے کام نہ لے کر اس کی بالواسطہ مدد کرتے ہیں، بی۔ جے۔ پی سکولر اور خاص طور پر مسلمانوں کے ووٹوں کو منقسم کر دینے کی ماہر ہے، اس وقت بعض ریاستوں میں خاص خاص سیکولر پارٹیاں اور بعض میں کئی مل کر اور چند میں تنہا کانگریس بی۔ جے۔ پی کو روک سکتی ہے، اگر ان ریاستوں کے مسلمان ان کا تعاون کریں اور مذہب، ذات، برادری کے چکر میں نہ پڑیں تو بی۔ جے پی کی پیش قدمی رک سکتی ہے، اگر اس حکمتِ عملی کے بعد بھی وہ برسرِ اقتدار آجاتی ہے تو اس سے خائف اور مایوس ہونے کی ضرورت نہیں، انہیں آئندہ کا لائحہ عمل تیار کرنا چاہیے اور یہ عقیدہ رکھنا چاہیے کہ جو کچھ ہوتا ہے، خدا کے حکم سے ہوتا ہے، اس سے دعا کرنی چاہیے کہ وہ اس آزمایش میں انہیں ثابت قدم رکھے اور ان کی دشواریاں آسان کرے۔ رَبَّنَا آتِنَا مِن لَّدُنكَ رَحْمَةً وَهَيِّئْ لَنَا مِنْ أَمْرِنَا رَشَدًا۔

مقالات

علم فتاویٰ اور کتب فتاویٰ

از ڈاکٹر جلال الدین احمد نوری، کراچی

فقہ اسلامی میں افتاء، استفتاء، الفتویٰ، الفتاوی، الفتیا (بضم الفاء) اور ان کے مشتقات کا استعمال بہت قدیم ہے، عربی لغت میں اس کا مادہ ف، ت، واو، یا، آتا ہے اور اسی مادے سے فتوی و فتوۃ کے الفاظ بھی دیے جاتے ہیں جن کے معنی نوجوان، جواں مرد اور جواں مردی کے بھی ہوتے ہیں" لویس معلوف[1] نے اپنی لغت کی کتاب" المنجد" میں "فتوی" کے معنی کرم وسخا، زیرکی، اور شباب کے بھی لکھا ہے۔

فتوی کا لفظ قرآن کریم میں بھی بہ کثرت معنوں میں آیا ہے مثلاً:

۱۔ **حکم دینا**:۔ وَيَسْتَفْتُونَكَ فِي النِّسَاءِ قُلِ اللَّهُ يُفْتِيكُمْ فِيهِنَّ[2] (اور لوگ آپ سے عورتوں کے بارے میں حکم دریافت کرتے ہیں۔ آپ فرما دیجیے اللہ ان کے بارے میں حکم دیتا ہے)

۲۔ **تحقیق چاہنا**:۔ يَسْتَفْتُونَكَ قُلِ اللَّهُ يُفْتِيكُمْ فِي الْكَلَالَةِ[3] (لوگ آپ سے دریافت کرتے ہیں۔ آپ فرما دیجیے کہ اللہ تم کو کلالہ کے باب میں حکم دیتا ہے) نیز فرمایا: قُضِيَ الْأَمْرُ الَّذِي فِيهِ تَسْتَفْتِيَانِ[4] (فیصل ہوا وہ کام جس کی تحقیق تم چاہتے تھے)

۳۔ **خواب کی تعبیر بتانا**:۔ يَا أَيُّهَا الْمَلَأُ أَفْتُونِي فِي رُؤْيَايَ[5] (اے دربار والو میرے اس خواب کے بارے میں تعبیر بتاؤ)

---

[1] المنجد، مطبوعہ بیروت، ۱۹۵۱ء، ص ۸۹ [2] نساء: ۱۲۷ [3] ایضاً ۱۷۶ [4] یوسف: ۴۱ [5] ایضاً ۴۳۔

۴۔ **جواب دینا**۔ يُوسُفُ أَيُّهَا الصِّدِّيقُ أَفْتِنَا[1] (اے یوسف اے صدق مجسم، آپ ہم لوگوں کو اس کا جواب دیجئے۔)

۵۔ **مشورہ دینا۔ چاہنا**۔ قَالَتْ يَا أَيُّهَا الْمَلَأُ أَفْتُونِي فِي أَمْرِي[2] (کہنے لگی اے دربار والو مشورہ دو مجھ کو میرے کام میں)

لفظ فتویٰ تاریخی اعتبار سے تاریخ فتاویٰ کا اگر بنظر تعمق مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ اس کا آغاز عہد نبوی سے ہوگیا تھا، رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں کس نے کس امر کے متعلق سب سے پہلا فتویٰ پوچھا، اس کے متعلق تو کچھ کہنا مشکل ہے لیکن کتب سیرت میں اس کی بکثرت مثالیں ملتی ہیں۔ پوچھنے والوں میں مرد بھی رہے ہیں اور عورتیں بھی، حضرت علی کرم اللہ وجہہ جیسے فاضل لوگ بھی ان میں نظر آتے ہیں اور کبھی بے چاری ان پڑھ بوڑھی عورتیں بھی فتویٰ طلبی کے خطوط بھی آتے اور ان کے تحریری جوابات بھی دیے جاتے۔ اس کا بھی پتہ چلتا ہے کہ خود رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک زمانے میں جب لوگ فتوے پوچھنے آتے اور آپ مصروف ہوتے تو فرماتے کہ جاؤ حضرت ابوبکرؓ سے پوچھو[3]۔

عورتوں کو بعض زنانہ مسائل کے متعلق مردوں سے کچھ پوچھتے شرم آتی ہے، عورتیں عورتوں ہی سے بے تکلف پوچھ سکتی ہیں، چنانچہ سورۂ احزاب میں ازواج مطہرات امہات المومنین کے فرائض میں اس کا اس طرح ذکر آتا ہے:

وَاذْكُرْنَ مَا يُتْلَىٰ فِي بُيُوتِكُنَّ	تمہارے گھروں میں اللہ کی آیتوں اور حکمت کا
مِنْ آيَاتِ اللَّهِ وَالْحِكْمَةِ (احزاب: ۳۴)	جو بیان ہوتا ہے اسے بیان کرو۔

[1] یوسف: ۴۶ [2] نمل: ۳۲ [3] تاریخ الخلفاء (ترجمہ اردو) شمس بریلوی ۱۲۰، مدینہ پبلشنگ کمپنی، بندر روڈ، کراچی ۱۹۸۰ء۔

اس میں مذکورہ قسم کے زنانہ فتوے بھی شامل ہیں اور دیگر عام احکام کے متعلق بھی، امام ابن حزم نے اپنی سیرت نبویہ میں عورتوں کی جو فہرست دی ہے ان میں زیادہ تر امہات المومنین اور ان کی پروردہ عورتیں نظر آتی ہیں، حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے متعلق مشہور حدیث ہے کہ ان سے آدھا علم سیکھ سکتے ہو، حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ اپنے خلافت کے زمانے میں اہم اور پیچیدہ مسئلوں میں امہات المومنین سے اکثر مشورہ فرمایا کرتے تھے۔

المختصر پہلا مجموعہ فتاویٰ تو قرآن کریم ہے جیسا کہ اس آیت کریمہ سے مترشح ہوتا ہے:

وَلَا يَأْتُونَكَ بِمَثَلٍ إِلَّا جِئْنَاكَ	اور یہ لوگ کیسا ہی عجیب سوال آپ کے
بِالْحَقِّ وَأَحْسَنَ تَفْسِيرًا (فرقان: ۳۳)	سامنے پیش کریں، مگر ہم ٹھیک جواب
	اور وضاحت میں بڑھا ہوا عنایت
	کر دیتے ہیں۔

قرآن کریم کے بعد احادیث نبوی صلی اللہ علیہ وسلم۔ لیکن یہ امور چونکہ فقہیہ و غیر فقہیہ مسئولہ وغیر مسئولہ پر محتوی ہے اس لیے جزوی طور پر فتاویٰ کا ذکر ملتا ہے، بعد میں رفتہ رفتہ فتویٰ نویسی نے ایک فن کی حیثیت اختیار کرلی اور بکثرت کتب فتاویٰ منظر عام پر آئیں۔

چونکہ فتاوے کا تعلق براہ راست علم فقہ سے ہے اس لیے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس کے مختلف ادوار کا مختصراً ذکر کر دیا جائے علامہ محمد الخضری نے اپنی تالیف "تاریخ التشریع الاسلامی" میں فقہ اسلامی کے یہ چھ ادوار قائم کیے ہیں۔

۱۔ فقہ بہ عہد رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم۔

۲۔ فقہ بہ عہد صحابہ کبار رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین۔

۳۔ فقہ بہ عہد صغار صحابہ و تابعین رضی اللہ تعالیٰ عنہم۔

(یہ عہد پہلی صدی ہجری یا اس کے کچھ دنوں بعد ختم ہوجاتا ہے)

۴۔ وہ عہد جب فقہ نے مستقل علم کی شکل اختیار کرلی۔

(یہ دور دوسری صدی کے اوائل سے شروع ہوکر تیسری صدی کے آخر میں ختم ہوجاتا ہے)

۵۔ وہ عہد جس میں ائمہ فقہا کے مابین مسائل فقہیہ پر بحثیں ہوئیں اور نہایت کثرت سے نقلی مسائل پیدا ہوئے۔

(یہ دور خلافتِ عباسیہ کے زوال اور تاتار گردی کے کچھ دنوں بعد ختم ہوجاتا ہے)

۶۔ فقہ بزمانہ تقلید۔ (یہ دور پانچوں دور کے بعد شروع ہوا اور آج تک قائم ہے)

متذکرہ بالا ادوار میں بکثرت مفتیوں کا پتہ چلتا ہے، تفصیلات کے لیے کتاب مذکور کا مطالعہ کیا جائے، یہاں ہم عہدِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کے فوراً ہی بعد کے بعض مفتیوں کا ذکر کرتے ہیں تاکہ قارئین کرام کو تاریخ فتاوے کی اولیات کا علم ہوجائے۔

مفتیان مدینہ

۱۔ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا (م ۵۸ھ) ۲۔ حضرت عبداللہ بن عمرؓ (م ۷۳ھ) ۳۔ حضرت ابوہریرہؓ (م ۵۸ھ) ۴۔ حضرت سعیدؒ بن المسیب المخزومی (م ۹۴ھ) ۵۔ حضرت عروہؒ بن زبیر بن العوام الاسدی (م ۹۴ھ) ۶۔ حضرت ابوبکرؒ بن عبدالرحمن (م ۹۴ھ) حضرت علیؒ بن الحسین (م ۹۴ھ) ۸۔ حضرت عبیدؒ اللہ بن عبداللہ (م ۹۸ھ)

مفتیان مکہ معظمہ

(۱) حضرت عبداللہ بن عباسؓ (م ۶۸ھ) (۲) حضرت مجاہدؒ بن زبیر (م۔ ۱۰۳ھ) (۳) حضرت عکرمہؒ ابن عباس (م۔ ۱۰۷ھ) (۴) حضرت ابوالزبیرؒ محمد بن مسلم (م ۱۲۸ھ)

مفتیان کوفہ

(۱) حضرت علقمہ بن قیس (م ۶۲ھ) (۲) حضرت مسروق الاجدع (م ۶۳ھ) (۳) حضرت شریح بن الحارث (م۔ ۹۵ھ) (۴) حضرت سعید بن جبیر (م۔ ۹۵ھ) (۵) حضرت عامر بن شرجیل (م۔ ۱۰۳ھ)

مفتیان شام

(۱) حضرت عبدالرحمن بن الغنم الاشعری (م۔ ۷۸ھ)

مفتیان مصر

(۱) حضرت عبداللہ بن عمرؓ العاص (م۔ ۷۰ھ) (۲) حضرت رجاء بن حیوۃ الکندی (م ۱۱۲ھ)

مفتیان یمن

(۱)۔ حضرت طاؤس بن کیسان الجندی (م۔ ۱۰۶ھ) (۲) حضرت وہب بن الصنعانی (م۔ ۱۱۴ھ)

پہلی صدی ہجری کے بعد فقہاء کا ایک طویل سلسلہ ہے، ان علماء و فقہاء نے کتب فقہ مدون کیں اور بعض نے کتب فتاویٰ مرتب کیں۔ خالص فتاوے کے تحریری مواد کی تاریخ بھی عہد صحابہ ہی سے شروع ہوتی ہے چنانچہ تاریخوں میں اکثر اس کا ذکر آتا ہے کہ ایک شخص ایک مرتبہ حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے پاس حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے فتوؤں کا مجموعہ لایا، انہوں نے پڑھ کر اس کی چند چیزوں کو تو برقرار رکھا اور باقی کو میٹ دیا اور فرمایا کہ یہ حضرت علیؓ کی طرف غلط منسوب ہے، وہ ہرگز ایسا فتویٰ نہیں دے سکتے۔ یہ واقعہ حضرت علی کی وفات کے بعد ہی کا ہوسکتا ہے، لیکن حضرت ابن عباسؓ بھی ایک صحابی ہیں، اس لیے اولین کتاب فتاویٰ گویا عہد صحابہ کی یادگار ہے۔ ابوالحسین البصری (م ۴۳۶ھ) نے اپنی کتاب المعتمد فی اصول الفقہ (ج ۲، ص ۲۹-۳۰۷) میں حضرت علیؓ ہی نہیں حضرت زیدؓ بن

ثابت کے فتوؤں کا بھی ذکر کیا ہے جو ظاہر کتابی صورت میں پانچویں صدی ہجری تک پائے جاتے تھے، یقیناً دیگر فقیہ صحابہ حضرت ابنؓ مسعود وغیرہ نے بھی بہت سے فتوے دیے ہوں گے جو ممکن ہے کہ جمع بھی ہوئے ہوں۔ تابعین کے زمانہ میں سب سے زیادہ خدمت اس علم کی قاضی کرتے تھے، ان کے پاس ہر روز مقدمے پیش ہوتے اور وہ اپنے فیصلوں کا بحذف مکررات انتخاب کرتے تھے۔ ایسا ایک مجموعہ امام ابو یوسف کی طرف منسوب بھی ہے، ان کے شریک درس امام محمد شیبانی کی کتاب الرقیات کو جواب نہیں ملتی، ان کے شہر "رقہ" کے "قضاۃ" کے زمانے کے فیصلوں کا مجموعہ بتائی جاتی ہے۔

اسلام کے جلیل القدر فقیہ حضرت ابو حنیفہ (رضی اللہ عنہ) نے بھی بعض معاصرین صحابہؓ کرامؓ سے فتوے پوچھے ہیں، چنانچہ تاریخوں میں ان صحابہؓ کے نام آتے ہیں:

(۱) حضرت انسؓ (م ۹۱ھ) (۲) حضرت عبد اللہ بن ابی اوفی (م ۸۷ھ) (۳) حضرت واثلۃ بن الاسقع (م ۸۳ھ) (۴) حضرت سہل بن ساعد (م ۸۸ھ) (۵) حضرت عامر بن واثلہ (م ۱۰۲ھ) وغیرہم۔

الغرض کتب فتاویٰ کی تاریخ عہد صحابہ و تابعین سے شروع ہوتی ہے۔ حاجی خلیفہ نے اپنی تالیف "کشف الظنون عن اسامی الکتب و الفنون" میں اسمٰعیل پاشا البغدادی نے اپنی تالیف "ھدیۃ العارفین فی آثار المولفین و المصنفین" میں اور بروکلمان نے تاریخ ادبیات عربی میں کتب فتاویٰ کا مفصل ذکر کیا ہے، موخر الذکر نے فتاوے نام کی ۲۰۰ کتابوں کا ذکر کیا ہے، یہاں ہم کشف الظنون وغیرہ سے بعض کتب فتاویٰ کا ذکر کریں گے، جن کا تعلق تیسری صدی ہجری سے گیارہویں صدی ہجری تک ہے۔

تیسری صدی ہجری: (۱) فتاوی ابی بکر (۲) فتاویٰ ابی القاسم۔

چوتھی صدی ہجری: (۱) فتاویٰ ابن قطان (۲) فتاویٰ ابی اللیث (۳) فتاویٰ ابن الجراد۔

پانچویں صدی ہجری: (۱) فتاویٰ ابن الصباغ (۲) فتاویٰ الاسبیجابی (۳) فتاویٰ خواہر زادہ (۴) فتاوی شمس الائمہ (۵) فتاویٰ الفضلی (۶) فتاوی النجندی۔

چھٹی صدی ہجری: (۱) فتاویٰ ابن ابی عصرون (۲) فتاویٰ ابی الفضل (۳) فتاویٰ الارغیانی (۴) فتاویٰ التمرتاشی (۵) فتاویٰ حسام الدین (۶) فتاویٰ الدنیازی (۷) فتاویٰ الرشیدی (۸) فتاویٰ سراجیہ (۹) فتاوی ظہیریہ (۱۰) فتاویٰ قاضی خاں (۱۱) فتاویٰ الکبریٰ (۱۲) فتاویٰ نضیہ (۱۳) فتاویٰ واسطیہ (۱۴) فتاویٰ شہاب الدین (۱۵) فتاویٰ الصغریٰ۔

ساتویں صدی ہجری: (۱) فتاوی ابن ابی الام (۲) فتاویٰ ابن رزین (۳) فتاویٰ بالصلاح (۴) فتاویٰ ابن عبد السلام (۵) فتاویٰ ابن مالک (۶) فتاویٰ صوفیہ (۷) فتاویٰ العربیہ (۸) فتاویٰ موہوب (۹) فتاویٰ الوالجی۔

آٹھویں صدی ہجری: (۱) فتاویٰ ابن عقیل (۲) فتاویٰ ابن فرکاخ (۳) فتاویٰ جلال الدین (۴) فتاویٰ حنیفہ (۵) فتاویٰ الزرکشی (۶) فتاویٰ السبکی (۷) فتاویٰ نووی (۸) فتاویٰ طرطوسیہ۔

نویں صدی ہجری: (۱) فتاویٰ ابن ابی شریف (۲) فتاویٰ حنبلی زادہ (۳) فتاویٰ قاسمیہ۔

دسویں صدی ہجری: (۱) فتاویٰ ابن الشلبی (۲) فتاویٰ ابی سعود (۳) فتاویٰ زینتیہ (۴) فتاویٰ الشلبی (۵) فتاویٰ عدلیہ۔

گیارہویں صدی ہجری،[1] فتاویٰ رضائی،[2] فتاویٰ شیخ الاسلام[3] مجمع الانہر وغیرہ اور بعض دیگر کتب فتاویٰ کا بھی پتہ چلتا ہے مثلاً:

(۱) جواہر الفتاویٰ (۲) فتاویٰ عبداللہ بن عباس (۳) فتاویٰ مہدیہ (۴) فتاویٰ خیریہ لنفع البریہ (۵) مغنی المستفتی عن سوال المفتی (۶) عقود الدریۃ فی تنقیح فتاویٰ الحامدیۃ (تالیف ۱۲۳۸ھ) (۷) فتاویٰ ابن تیمیہ (۸) فتاویٰ برہمنہ۔

پاک وہند میں کتب فتاویٰ کی تاریخ بہت قدیم ہے۔ اس برعظم پر مسلمان حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے عہد مبارک میں پہنچ چکے تھے، اس کے بعد حجاج بن یوسف کے زمانے میں کچھ خاندان ہندوستان کے جنوبی سواحل پر آباد ہوگئے، بعد میں تجارت کے فروغ سے یہاں عرب تاجروں کی مستقل آبادیاں قائم ہوگئیں۔ ادھر سندھ میں عربوں کی فاتحانہ پیش قدمی نے یہاں انقلاب پیدا کر دیا۔ اس علاقے میں عربوں کا اثر و رسوخ بھاولپور و ملتان تک چوتھی صدی ہجری تک رہا، بہرکیف جب اس برعظم میں آزاد سلطنتیں قائم ہوئیں تو فتووں کا سلسلہ بھی شروع ہوا، جگہ جگہ مدارس و مساجد میں علمائے کرام موجود تھے جو فتوے دیا کرتے تھے، مسلمانوں سے غیر مسلموں نے بھی شریعت اسلامیہ کے بارے میں استفسارات کیے ہیں،

[1] حاجی خلیفہ: کشف الظنون، جلد دوم، ص ۲۱۸ تا ۲۳۰/ [2] مجمع الانہر فی شرح ملتقی الابحر/ عبدالرحمن بن شیخ محمد بن سلیمان المدعو بہ شیخ زادہ کی تالیف ہے بلدۂ ادرنہ (دوم) میں ۱۹ جمادی الآخر ۱۰۷۷ھ میں مکمل ہوئی اور ۱۲۶۴ھ میں ترکی میں شایع ہوئی، پاک وہند میں کتب فتاویٰ کی مستند کتابوں میں شمار کی جاتی ہے۔ [3] شیخ نصیر الدین مینائی کی تالیف ہے اس کا دوسرا اڈیشن ۱۳۰۲ھ ۱۸۸۵ء میں نول کشور پریس، لکھنؤ میں چھپا تھا، یہ کتاب بھی کتب فتاویٰ کی مستند کتابوں میں شمار کی جاتی ہے۔

چنانچہ اسی قسم کے استفسارات کا حال بزرگ بن شہریار کی کتاب عجائب الہند سے معلوم ہوتا ہے۔ بزرگ بن شہریار ایک عرب جہازراں محمد حسن نامی کی زبانی تیسری صدی ہجری کا یہ واقعہ نقل کرتا ہے: "میں ۲۸۸ھ میں منصورہ میں تھا۔ وہاں مجھ سے مستند بزرگوں نے بیان کیا کہ "الوا" کے راجہ نے جو ہندوستان کا بڑا راجہ تھا اور جس کی حکومت کشمیر زیریں میں تھی اور جس کا نام مہروک بن رائق تھا۔ ۲۷۰ھ میں منصورہ کے بادشاہ عبداللہ کو لکھا کہ وہ اسلام کی شریعت کا کچھ حال زبان ہندیہ میں اس کو بتائے[1]

چنانچہ ایک عراقی الاصل سندھی عالم نے اس استفتاء کا جواب لکھا جو ایک منظوم نظم کی صورت میں تھا۔

پاک وہند کے مسلمان بادشاہوں اور امیروں کو نہ صرف فقہ اسلامی سے دلچسپی تھی بلکہ انھوں نے اس فن میں تصانیف بھی چھوڑی ہیں، چنانچہ سلطان محمود غزنوی فقہ اسلامی کا زبردست عالم تھا، اس نے ایک کتاب "التفرید فی الفروع" لکھی تھی جو بلاد غزنہ میں بہت مقبول ہوئی، اس میں شافعی مذہب کے مطابق بکثرت مسائل بیان کیے گئے ہیں۔ امام مسعود بن شیبہ جو اعیان فقہاء میں سے تھے، انھوں نے سلطانی نسخہ سے اس کو نقل فرمایا تھا۔[2] اسی طرح ظہیر الدین بابر "بادشاہ" نے بھی اصول مذاہب پر ایک کتاب لکھی تھی۔[3] خوندمیر نے بادشاہ ہمایوں کے ایماء پر قانون ہمایوں کے نام سے فقہ میں ایک کتاب لکھی۔[4]

[1] بزرگ بن شہریار: عجائب الہند، مطبوعہ لیڈن ۱۸۸۶ء، بحوالہ "ہندوستان عربوں کی نظر میں"، مطبوعہ اعظم گڈھ، ۱۹۶۰ء، ص ۴۳-۱۹۳ [2] الجواہر المضئیۃ، جلد دوم، ص ۱۵۰ (نزہۃ الخواطر، جلد اول، ص ۹۵ [3] سید نوشہ علی: مسلمانان ہند و پاکستان کی تاریخ تعلیم، مطبوعہ کراچی ۱۹۶۲ء ص ۱۷ [4] ابوالفضل: اکبرنامہ، ص ۱۲۶۔

پاک وہند میں جو ممتاز کتب فتاویٰ نظر آتی ہیں وہ بھی مسلمان بادشاہوں اور امیروں کی مرہون منت ہیں، تاریخ کے مطالعہ سے ان کتب فتاویٰ کا پتہ چلتا ہے۔

(۱) فتاویٰ فیروز شاہی (۲) فتاویٰ ابراہیم شاہی

(۳) فتاویٰ اکبر شاہی (۴) فتاویٰ عادل شاہی

(۵) فتاویٰ تاتارخانی (۶) فتاویٰ عالم گیری وغیرہ

موخر الذکر کی نگرانی شیخ نظام برہانپوری فرما رہے تھے، دہلی کے نامی گرامی علمار فقہار کے علاوہ اطراف واکناف کے بکثرت علمار کو بلایا گیا تھا۔ ایک اندازے کے مطابق پچاس سے زائد علمار اس کام کے لیے مختص تھے، حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی کے والد ماجد شاہ عبدالرحیم صاحب رحمۃ اللہ علیہ بھی اس کی تدوین میں "ملا حامد" کے معاون تھے، لیکن بعد میں عزلت پسندی کی وجہ سے علیحدہ ہوگئے[1]۔

فتاویٰ عالمگیری اصلاً عربی میں لکھی گئی تھی۔ اس کے بعد خود عالمگیر نے مولانا عبداللہ رومی سے اس کا فارسی زبان میں ترجمہ کرایا، مولانا موصوف روم سے ہندوستان وارد ہوئے تھے[2]۔ بختاور خاں نے "مرأۃ العالم" میں ان کی بڑی تعریف لکھی ہے۔

فتاویٰ عالمگیری عرب وعجم میں مقبول ہے، مصر سے بھی اس کے اڈیشن شایع ہوئے ہیں، ہندوستان میں مولانا امیر علی لکھنوی نے اس کا اردو ترجمہ کیا ہے جو فتاویٰ ہندیہ کے نام سے مشہور ہے۔

یہ تو شاہی سرپرستی کی کتابیں ہیں، خانہ نشین اہل علم کے نجی فتووں کے مجموعے بھی ہر

[1] محمد کاظم: عالم نامہ، ص ۱۰۸۷، صباح الدین: بزم تیموریہ، ص ۲۳۸، شاہ ولی اللہ: انفاس العارفین، ص ۷۹ [2] معین الحق: معاشرتی وعلمی تاریخ، ص ۴۰۔

شہر میں ملیں گے کیونکہ فتویٰ طلبی کی ضرورت ہر اس مقام پر ہوتی ہے جہاں دیندار مسلمان رہتا ہو۔ پارس کی مسجد میں استفتاء آتے ہیں تو فتوے فرانسیسی میں دیے جاتے ہیں۔ انگلستان میں آج کل اُناسی مسجدیں ہیں اور اس تعداد میں الحمد للہ اضافہ ہو رہا ہے۔ وہاں کے اسلامی رسالوں میں باب الاستفتاء بھی اب نظر آنے لگا ہے۔

پاک وہند کے اسلامی دور حکومت میں چونکہ ایسی عدالتیں قائم تھیں جو قانونِ وقت اور قانون شریعت کے مطابق مقدمات فیصل کرتی ہیں، اس لیے نجی فتووں کے زیادہ تر مجموعے اس وقت نظر آتے ہیں جب مسلمان دور غلامی میں داخل ہوئے، چنانچہ ۱۸۵۷ء سے کچھ قبل اور بعد میں مختلف زبانوں میں عموماً اردو زبان میں خصوصاً اس قسم کے مجموعوں کا پتہ چلتا ہے، چنانچہ قاموس الکتب اردو مطبوعہ کراچی ۱۹۶۱ء میں اردو کتب فتاویٰ کی ایک ناقص فہرست دی گئی ہے، ہم وہاں سے اور دیگر ماخذ سے بعض اردو کتب فتاویٰ کا ذکر کرتے ہیں جس سے قارئین کرام کو اندازہ ہوگا کہ زبان اردو میں اس فن میں کس قدر سرمایہ موجود ہے۔

کتب فتاویٰ (اردو)

احمد حسین خاں: فتاوی محبوبیہ، مطبوعہ دہلی ۱۳۱۶ھ، احمد رضا خاں[1]: العطایا النبویہ فی الفتاویٰ الرضویہ (۱۲ جلدیں) مطبوعہ بریلی، ۱۳۱۰ھ (۳) ایضاً: احکام شریعت (۴) ایضاً: عرفان شریعت (۵) احمد یار خاں: فتاویٰ نعیمیہ (۶) ارشاد حسین رامپوری:

[1] مولانا احمد رضا خاں صاحب جو "اعلیٰ حضرت" کے لقب سے مشہور ہیں، بڑے متبحر عالم اور صاحب تصنیف بزرگ تھے، آپ کے بے شمار فتوے کتابچوں کی صورت میں شایع ہوئے ہیں جو ضخیم کتب فتاویٰ کے علاوہ ہیں، آپ کے تفصیلی حالات کے لیے مولانا رحمان علی کا تذکرۂ علمائے ہند کا مطالعہ کیا جائے۔

فتاویٰ ارشادیہ، مطبوعہ ۱۹۵۵ء (۷) اشرف علی تھانوی امداد الفتاویٰ، مطبوعہ کراچی [1] (۸) اصغر حسین: فتاویٰ محمدیہ (۹) اعزاز علی، اعزاز الفتاویٰ (قلمی) (۱۰) امجد علی: فتاویٰ امجدیہ (۱۱) امداد علی: امداد الفتاویٰ، مطبوعہ آگرہ، ۱۸۷۰ء (۱۲) امیر الدین گوپاموی، مفتی: فتاویٰ امریہ، قلمی (۱۳) امیر علی لکھنوی، فتاویٰ ہندیہ (ترجمہ فتاویٰ عالم گیری) مطبوعہ لکھنؤ (۱۴) برکت علی فرنگی محلی: ترجمہ اردو فتاویٰ مولانا عبد الحیٔ لکھنوی (قلمی) (۱۵) رحیم الدین: فتاویٰ صدارت العالیہ حیدر آباد دکن، مطبوعہ حیدر آباد دکن، ۱۳۴۵ھ (۱۶) رشید احمد گنگوہی، فتاویٰ رشیدیہ، مطبوعہ ۱۳۶۲ھ (۱۷) رکن الدین مفتی، فتاویٰ نظامیہ، مطبوعہ حیدر آباد دکن (۱۸) زاہد القادری، فتاویٰ آستانہ، مطبوعہ دہلی: ۱۹۵۴ء (۱۹) صدیق حسن خاں: مجموعہ آگرہ، ۱۳۰۷ھ (۲۰) ظفر احمد: امداد الاحکام (قلمی) (۲۱) عابد علی کشمیری: مجموعۃ الفتاویٰ، مولانا عبد الحیٔ، مطبوعہ آگرہ، ۱۳۰۷ھ (۲۲) عبد الباری فرنگی محلی: فتاویٰ قیام الملتہ والدین، مطبوعہ لکھنؤ (۲۳) عبد الحفیظ، مجموعہ فتاویٰ (قلمی) (۲۴) عبد الرحمن میر فتاویٰ: علماء اہل السنت والجماعت، مطبوعہ دت پرشاد پریس

---

[1] ۱۲۹۶ھ میں جب مولانا اشرف علی صاحب دار العلوم دیوبند میں تحصیل علم کے لیے تشریف لائے تو اس زمانے کے بیشتر فتاوے مولانا محمد یعقوب (مفتی مدرسہ دیوبند) نے آپ سے لکھوائے، ان کی نقول مولانا اشرف علی نے اہتمام کے ساتھ رکھیں، چنانچہ بعد میں یہ فتوے اور دیگر فتاوے "امداد الفتاوی" کے نام سے شایع ہوئے، اس کے تین حصے تھے، حصہ اول ۱۳۰۱ھ کے فتوے حصہ دوم میں ۱۳۰۱ھ سے ۱۳۱۴ھ تک کے فتوے (بزمانۂ قیام کانپور) اور تیسرے حصے میں ۱۳۱۵ھ کے بعد کے فتوے (بزمانہ قیام تھانہ بھون) لکھے گئے، اس حصے کے بیشتر فتووں میں مولانا رشید احمد گنگوہی سے مراجعت کی گئی ہے۔ فتاویٰ السنۃ، مطبوعہ بریلوی، ۱۳۱۴ھ۔

(۲۵) عبد الرزاق مکی حیدر آبادی: (۲۶) عبد العزیز: فتاویٰ عزیزنا المکرم (قلمی) (۲۷) عبد الغفار لکھنوی: فتاویٰ بے نظیر، ۱۲۹۰ھ (۲۸) عبد الفتاح مفتی: جامع الفتاویٰ، مطبوعہ ۱۳۰۳ھ (۲۹) عبد القدوس شاہ: شرح الفتویٰ، مطبوعہ ۱۲۹۰ھ (۳۰) عبد الکریم: امداد المسائل (قلمی) (۳۱) عبد الواحد سیوستانی، علامہ: فتاویٰ قاسمیہ، مطبوعہ لاہور، ۱۳۳۶ھ (۳۲) محمد شفیع مفتی: امداد المفتین، مطبوعہ کراچی سنہ (۳۳) محمد قاسم: فتاویٰ قاسمیہ، مطبوعہ لاہور ۱۳۵۳ھ (۳۴) محمد مسعود شاہ: فتاویٰ مسعودی (قلمی) ۱۲۹۶ھ تا ۱۳۰۴ھ (۳۵) مراد خاں: ترجمہ فتاویٰ عزیزی، مطبوعہ ۱۳۱۲ھ (۳۶) مہر علی شاہ گولڑوی: مجموعہ فتاویٰ (مہریہ) (۳۷) نذیر حسین دہلوی: فتاویٰ نذیریہ، مطبوعہ دہلی (۳۸) نظام الدین حنفی: فتاویٰ نظامیہ، مطبوعہ لاہور، ۱۹۲۰ء (۳۹) نواب علی وعبد الجلیل: ترجمہ فتاویٰ عزیزی، مطبوعہ حیدر آباد دکن ۱۳۱۳ھ۔

متذکرہ بالا فتاویٰ کے علاوہ بعض فتاوے وہ ہیں جن کے صرف نام معلوم ہوسکے، مثلاً فتاویٰ غوثیہ، فتاویٰ سعدیہ، فتاویٰ عثمانیہ، فتاویٰ مفتی محمد رمضان، فتاویٰ مفتی نثار احمد کانپوری وغیرہ، پاک و ہند کے بکثرت علماء ایسے بھی ہیں جنھوں نے بے شمار فتاوے دیے مگر یا تو وہ جمع نہ ہوسکے یا وہ ہمارے علم میں نہیں ہیں، ان علمائے کرام کی فہرست بھی بڑی طویل ہے۔

(باقی)

علامہ شبلیؒ کی سیرۃ النبیؐ

از جناب محمد الیاس الاعظمی

"الیاس اعظمی ایک ہونہار نوجوان ہیں اور شبلی نیشنل پوسٹ گریجویٹ کالج سے علامہ شبلی پر ریسرچ کر رہے ہیں، معارف کا مقصد ہونہار اور باصلاحیت نوجوانوں کی حوصلہ افزائی اور علمی تربیت بھی ہے، اس لیے یہ مضمون شایع کیا جارہا ہے اور آیندہ بھی ان کے مضامین شایع ہوں گے۔"

سیرۃ النبی علامہ شبلی نعمانیؒ کی آخری مگر سب سے زیادہ مہتم بالشان اور شہرۂ آفاق تصنیف ہے۔ وہ خود بھی اسے اپنی زندگی کا حاصل اور اپنے لیے وسیلۂ نجات خیال کرتے تھے[1] اس کی تالیف وتدوین میں ان کا جذبۂ خلوص اور رسول اللہؐ سے غیر معمولی عقیدت وشیفتگی بھی شامل ہے اور یہ ان کے وسعت مطالعہ، غور وفکر، دقت نظر، تحقیق وتدوین، تلاش وتفحص، مورخانہ اجتہاد وبصیرت، حسن استدلال، ادبی لطافت اور اسلوب نگارش کی دلآویزی کا نمونہ بھی ہے، اسی لیے یہ بڑی اہم، جامع اور عدیم المثال تصنیف خیال کی جاتی ہے۔ مولانا شاہ معین الدین احمد ندوی نے لکھا ہے کہ "یہ کتاب اپنی خصوصیت میں سیرت کے سارے ذخیرۂ کتب میں خواہ وہ کسی زبان میں لکھی گئی ہوں منفرد حیثیت رکھتی ہے حتی کہ عربی میں بھی اس نوعیت کی ایسی جامع کوئی سیرت نہیں لکھی گئی"[2]

[1] مکاتیب شبلی، ج ۱، ص ۱۰۸ [2] معارف سلیمان نمبر، ص ۱۲۸۔

گو علامہ شبلی کی سیرۃ النبی تقریباً ۱۰۰ برس پہلے لکھی گئی ہے لیکن ابھی تک اس کی شہرت ومقبولیت اور اہمیت ومعنویت میں کوئی فرق نہیں آیا۔ اس کے بے شمار ایڈیشن نکل چکے ہیں اور دنیا کی کئی زبانوں مثلاً عربی، انگریزی، پشتو، ملیالم اور ترکی میں اس کے ترجمے ہوچکے ہیں[1]۔

ذات نبویؐ سے مصنف کی عقیدت

علامہ شبلی کو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات گرامی سے ابتدا ہی سے خاص عقیدت ومحبت اور والہانہ شیفتگی تھی، مولانا سید سلیمان ندویؒ کے بقول "اس نام نامی کے ساتھ ان کی عقیدت کی کوئی حد پایاں نہ تھی"[2] اس کا اظہار بھی شعوری ولاشعوری طور پر ہوتا رہا، علی گڑھ کے زمانۂ قیام میں ان کے قلم سے جو تحریر سب سے پہلے نکلی وہ تاریخ بدر الاسلام تھی، جس کا تعلق اصلاً سیرت ہی سے ہے، یہ سرسید کی فرمایش پر عربی زبان میں درسی ضروریات کے پیش نظر ۱۸۹۱ء میں لکھی گئی[3] اور عرصہ تک کالج کے نصاب میں داخل رہی، مقتدی خاں شیروانی نے اسے سیرۃ النبی کا تخم قرار دیا ہے[4]، سرسید ہی کی فرمایش پر علامہ حمید الدین فراہیؒ نے اس کا فارسی میں ترجمہ کیا بعد میں آغاز اسلام کے نام سے میمونہ سلطان شاہ بانو (بیگم حمید اللہ خاں بھوپال) نے اردو ترجمہ کیا، اردو میں ایک اور ترجمہ حیات النبی کے نام سے تاج کمپنی کراچی نے شایع کیا ہے، جس پر مترجم کا نام درج نہیں ہے[5] اس کے بارے میں ڈاکٹر انور خالد محمود لکھتے ہیں:

"اس رسالہ نے نہ صرف طلبہ کے دلوں میں حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے عقیدت ومحبت کے جذبات پیدا کیے بلکہ خود مصنف کے دل میں بھی عشق رسول کی قندیل روشن کر دی"[6]

چنانچہ مولانا نے کالج میں میلاد کی مجلسوں میں سیرت نبویؐ کے کسی پہلو پر تقریر کرنے کا

[1] مولانا شبلی پر ایک نظر، ص ۱۳۲ [2] حیات شبلی، ص ۱۰، [3] یاد رفتگاں، ص ۱۱۶ [4] مقالات یوم شبلی، ص ۱۱
[5] کتاب نامہ شبلی، ص ۲۰ [6] اردو نثر میں سیرت رسولؐ، ص ۵۳۸۔

سلسلہ شروع کیا اور بعد میں میلاد کی یہ تقریبات نہایت شان و شوکت کے ساتھ سالار منزل میں منعقد ہونے لگیں۔[1]

علامہ شبلی نے اپنے اشعار و قطعات میں بھی ذات نبویؐ سے اپنی عقیدت و محبت کا اظہار کیا ہے، سیرۃ النعمان کے منظوم دیباچہ (۶) میں ان کا عشق حد انتہا پر دکھائی دیتا ہے ؎

شیفتگانیم و پیمبر پرست   سجدہ اگر نیست زمیں بوس ہست

حیدرآباد کے زمانۂ قیام میں بھی جب وہ علم الکلام اور الکلام کی تدوین و تصنیف میں مشغول تھے، اس وقت بھی سیرت نبوی ان کی توجہ کا خاص مرکز رہی اور سب سے پہلے یہیں سیرۃ النبی کی ابتدا بھی کی[2] اور ۳ھ تک کے واقعات مورخانہ انداز میں لکھے مگر مولانا سید سلیمان ندوی کا بیان ہے کہ وہ جس انداز سے سیرت نبوی لکھ رہے تھے غالباً وہ خود انہیں پسند نہیں آیا اور وہ آگے نہ لکھ سکے،[3] ان کی نگاہ میں سیرت نبوی کی تالیف کا معیار بہت بلند تھا وہ فرماتے تھے کہ سوانح عمری ایسی لکھنی چاہیے جس سے صاحبِ سوانح کا پایہ اونچا نظر آئے، لیکن ہم مسلمانوں کے دلوں میں سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کی عقیدت کا پایہ اتنا اونچا ہے کہ کوئی کتاب اس کی بلندی کو نہیں پہونچ سکتی، اس لیے سیرت کی کوئی کتاب مشکل ہی سے معیار پر پوری اتر سکتی ہے۔[4]

علامہ شبلی نے جب نامورانِ اسلام کا سلسلہ شروع کیا تو بقول مولانا سید سلیمان ندوی "بار بار ان کے اور دوسروں کے دل میں خیال آیا کہ ان ناموروں سے پہلے سب سے اول اس نامور کا نام آنا چاہیے جس کی ناموری نے ان سب کو نامور بنایا ہے"[5] مگر یہ ایسا اہم اور

۱؎ حیات شبلی، ص ۱۴۴ ۲؎ مکاتیب شبلی، ج ۱، ص ۳۶ ۳؎ حیات شبلی، ص ۷۰۲ ۴؎ ایضاً، ص ۷۰۳ ۵؎ ایضاً، ص ۷۰۲۔

نازک فریضہ تھا کہ علامہ شبلی باوجود اس کی اہمیت و افادیت، ضرورت اور ذات گرامی سے عشق کے عرصہ تک اس کے ادا کرنے کی جرأت نہ کر سکے[1] کیونکہ ان کا خیال تھا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے واقعات میں ایک حرف بھی صحت کے اعلیٰ معیار سے ذرا اتر جائے تو سخت جرم ہے۔[2]

اس شدید احساس کے باوجود متعدد اسباب کی بنا پر سیرت نبوی کی ضرورت کا خیال ان کے دل میں برابر جاگزیں رہا اور قوم کی طرف سے بھی اس کے لیے پیہم اصرار ہوتا رہا جس کی بنا پر سیرت نبوی کی تالیف کا عزم مصمم کر لیا اور جنوری ۱۹۱۲ء میں ماہنامہ الندوہ میں 'مجلس تالیف سیرت' کے قیام کا اعلان کیا اور قوم سے اس میں معاونت کی خواہش کی۔

تالیفِ سیرت کے مقاصد و ضروریات

ذیل میں ان اسباب و مقاصد کا ذکر کیا جاتا ہے جو سیرۃ النبی جیسی معرکۃ الآرا اور بے مثال کتاب کی تالیف کا باعث بنے۔

تالیف سیرت کا پہلا سبب حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے علامہ شبلی کی عقیدت و محبت کا بے پایاں جذبہ تھا۔ اور وہ اس کو سعادتِ دارین کا ذریعہ اور وسیلۂ نجات سمجھتے تھے، بقول ڈاکٹر سید عبداللہ:

"سیرۃ النبی بنیادی طور پر ایک عاشقِ رسولؐ کا والہانہ اظہار عقیدت ہے۔۔۔۔ یہ ایک گدائے بے نوا کی شہنشاہ کونین کے دربار میں اخلاص و عقیدت کی نذر ہے، جس کی فرط عقیدت پکار پکار کر کہہ رہی ہے ؎

زچشم آستیں بردار و گوہر را تماشا کن[3]

مگر سیرت النبی صرف ایک عقیدت مند کا نذرانۂ عقیدت ہی نہیں ہے بلکہ دور جدید کے

۱؎ سیرۃ النبی ج ۱ مقدمہ ص ۴ ۲؎ مقالات شبلی، ج ۸، ص ۳۳ ۳؎ سرسید اور انکے نامور رفقاء ص ۱۴۹۔

معیار و مذاق کے مطابق بھی ایک اہم تصنیف ہے۔

۲۔ تالیف سیرت کا دوسرا سبب یہ تھا کہ مسلمانوں کے پاس اردو زبان میں سیرت پر کوئی معتبر، مستند اور جامع کتاب نہ تھی اور جو کتابیں تھیں علامہ شبلی کے الفاظ میں "انہیں سیرت نبوی کہنا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی روح مبارک کو آزردہ کرنا ہے"[1] اس لیے یہ ایک اہم قومی اور دینی ضرورت تھی کہ اردو میں سیرت نبوی پر ایک مکمل و مفصل اور مستند و جامع کتاب لکھی جائے۔

۳۔ اردو ہی نہیں دوسری زبانوں میں بھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی مستند اور دور جدید کے معیار و مذاق کے مطابق سوانح عمری موجود نہ ہونے کی وجہ سے جدید تعلیم یافتہ طبقہ جو عربی علوم و فنون سے ناواقف تھا انگریزی کتابوں کی طرف رجوع کرتا تھا جو نہ صرف یہ کہ صحیح نقطہ نظر سے نہیں لکھی گئی تھیں بلکہ ان میں جا بجا زہر بھی بھرا ہوا تھا، جن کو پڑھ کر لوگ زیغ و ضلال کا شکار ہو رہے تھے اور رفتہ رفتہ ملک میں جدید دانشوروں کا ایک ایسا طبقہ بھی وجود میں آگیا تھا جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو یورپ کے معیار کے مطابق محض ایک مصلح تصور کرتا تھا[2]، اس لیے ضرورت تھی کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے مستند حالات و سوانح جدید طرز تحقیق کے مطابق اس طرح لکھے جائیں کہ نیا تعلیم یافتہ طبقہ اس سے اپنی علمی پیاس بجھا سکے۔

۴۔ علامہ شبلی کے نزدیک سیرت نبوی کی ضرورت صرف تاریخی حیثیت ہی سے نہیں تھی بلکہ مستشرقین نے جب اس کو اپنا موضوع بنایا تو انھوں نے اس کے جلو میں عقائد کی بحثیں بھی شامل کر لی تھیں، گویا سیرت جدید علم کلام کا ایک اہم موضوع ہو گیا تھا، چنانچہ علامہ شبلی

---

[1] مقالات شبلی، ج، ص ۳۲ [2] سیرۃ النبی، ج ۱، مقدمہ ص ۵۔

لکھتے ہیں:

"اگلے زمانہ میں سیرت کی ضرورت صرف تاریخ اور واقعہ نگاری کی حیثیت سے تھی علم کلام سے اس کو واسطہ نہ تھا لیکن معترضین حال کہتے ہیں کہ اگر مذہب صرف خدا کے اعتراف کا نام ہے تو یہ بحث یہیں تک رہ جاتی ہے لیکن اگر اقرار نبوت بھی جزو مذہب ہے تو یہ بحث پیش آتی ہے کہ جو شخص حامل وحی اور سفیر الٰہی تھا اس کے حالات، اخلاق اور عادات کیا تھے"[1]

دراصل سیرت نبوی کی تالیف کا یہ نہایت اہم سبب ہے اور علامہ شبلی اس کو تمام دینی و دنیوی ضروریات کا مجموعہ بتاتے ہوئے لکھتے ہیں:

"یہ ضرورت صرف اسلامی یا مذہبی ضرورت نہیں ہے، بلکہ ایک علمی ضرورت ہے، ایک اخلاقی ضرورت ہے، ایک تمدنی ضرورت ہے، ایک ادبی ضرورت ہے اور مختصر یہ کہ مجموعہ ضروریات دینی و دنیوی ہے"[2]

۵۔ علامہ شبلی نے سیرۃ النبی کی تالیف کا بنیادی مقصد اور اس کی اصل غرض و غایت نفوس انسانی کے اخلاق و تربیت کی اصلاح و تکمیل بتایا ہے اور اسے وہ کائنات کا سب سے اہم اور مقدس فریضہ تصور کرتے تھے، ان کے نزدیک اس کا سب سے عمدہ طریقہ یہ ہے کہ فضائل اخلاق کا ایک پیکر مجسم سامنے آجائے جو خود ہمہ تن آئینۂ عمل ہو، دنیا کی تاریخ میں ان کے نزدیک ایسی جامع اور کامل ہستی صرف حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ہے کیونکہ نفوس انسانی میں صرف آپؐ ہی کے حالات اور کارنامۂ زندگی نہایت وسعت و تفصیل اور صحت و صداقت کے ساتھ قلم بند کیے گئے ہیں، یہاں تک کہ آپؐ کی ایک ایک ادا محفوظ رہ گئی ہے"[3]

---

[1] سیرۃ النبی ج ۱، مقدمہ ص ۵ [2] ایضاً ص ۴ [3] ایضاً ص ۱-۴۔

۶۔ علامہ شبلی کا یہ بھی خیال تھا کہ علوم و فنون میں سیرت کا ایک خاص درجہ ہے اور اس کی غرض و غایت عبرت پذیری اور نتیجہ رسی ہے، اس لیے اس وجود مقدس کی سوانح عمری کی ضرورت نہ صرف ہم مسلمانوں کو ہے بلکہ تمام عالم کو اس کی ضرورت ہے[1] اور غالباً اسی لیے وہ چاہتے تھے کہ سیرت میں ہر قسم کے مطالب آجائیں اور وہ صرف سیرت نہ ہو بلکہ انسائیکلوپیڈیا ہو[2]۔

۷۔ نفوس انسانی کی تربیت و اصلاح ہی کی غرض سے علامہ شبلی مورخین یورپ کے کذب و افترا اور ان کی غلطیوں کی تردید کرنا چاہتے تھے، یہ صحیح ہے کہ اس میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے ان کی عقیدت و محبت اور ان کی دینی حمیت و غیرت کو بھی بڑا دخل تھا تاہم اس کے پس پشت اصل مقصد اسلام کی حقیقی عظمت و بلندی کے ساتھ مورخین یورپ کے خیالات کی اصلاح ہی تھا اور اسی لیے وہ سیرۃ النبی کے انگریزی ترجمہ کے آرزومند بھی تھے، ایک جگہ لکھا ہے کہ:

"سیرت نبویؐ کی اشاعت کی ضرورت سب سے زیادہ یورپ میں ہے تاکہ یورپ کے خیالات کی اصلاح ہو سکے"[3]

بالآخر علامہ شبلی کو مذکورہ اسباب و مقاصد اور قوم کے اس پیہم اور شدید تقاضے نے کہ "وہ سب کام چھوڑ کر سیرت نبویؐ کی تالیف میں مصروف ہو جائیں"[4] مجبور کر دیا کہ وہ سیرت نبوی پر ایک جامع، مستند، مکمل اور مبسوط کتاب کی تالیف کا یہ گراں بار فریضہ انجام دیں، لیکن جیسا کہ پہلے واضح کیا جا چکا ہے علامہ شبلی کی نظر میں تالیف سیرت کا معیار بہت بلند تھا اس لیے یہ بڑا دقت طلب اور مشکل کام تھا، ان کی نگاہ اس حقیقت پر بھی تھی کہ "آج تک کوئی ایسی کتاب

[1] سیرۃ النبی ج ۱، مقدمہ ص ۱۔۴ [2] مکاتیب شبلی، ج ۱، ص ۲۰۲ [3] مقالات شبلی، ج ۸، ص ۳۶ [4] ایضاً ص ۳۳

نہیں لکھی گئی جس میں صرف صحیح روایتوں کا التزام کیا جاتا"[1] وہ لکھتے ہیں:

"جس طرح امام بخاری و مسلم نے یہ التزام کیا ہے کہ کوئی ضعیف حدیث بھی اپنی کتاب میں درج نہ کریں گے، اس طرح سیرت کی تصنیفات میں کسی نے یہ التزام نہیں کیا ہے، آج بیسیوں کتابیں قدمار سے لے کر متاخرین تک کی موجود ہیں، مثلاً سیرت ابن اسحاق، سیرت ابن ہشام، سیرت ابن سید الناس، سیرت دمیاطی، حلبی، مواہب لدنیہ کسی میں یہ التزام نہیں ہے"[2]

اس قدر بلند معیار پر سیرت نبویؐ کی تالیف و تدوین واقعتاً فرد واحد کے بس کی بات نہیں تھی اور شاید اسی احساس کے پیش نظر علامہ شبلی نے تجویز پیش کی کہ "مجلس تالیف سیرت نبویؐ" بنائی جائے جس کے علمی و مالی معاملات کے لیے باقاعدہ ایسے ارکان ہوں جو مربی بن کر کم از کم ایک ہزار یکمشت یا دس روپے ماہوار دیں یا عام ارکان ایک روپیہ ماہوار عنایت کریں یا معین بن کر نادر و نایاب اور قلمی کتابیں بہم پہونچائیں اور کسی اور مفید طریقہ سے مدد کریں تاکہ مصنفین یورپ نے جو کتابیں سیرت میں لکھی ہیں ان کو یکجا کیا جا سکے اور کچھ مترجم ہوں جو ان کو پڑھ کر ان کے اعتراضات کا خلاصہ کر سکیں اور کچھ علما رہوں جو روایات کی تلاش و تنقید اور چھان بین کا کام کریں، کچھ مسودہ نویس ہوں جو مسودوں کو صاف کریں، اس لائحہ عمل کی صراحت کے بعد انہوں نے اخراجات کے لیے قوم سے ڈھائی سو ماہوار اور کتابوں کی خریداری کیلئے کچھ نقد روپے کی درخواست کی، عجیب بات ہے کہ شاہ شاہان کی سیرت نگاری کے لیے شبلی بے نوا کی اس درخواست پر ایک فرمانروائے ریاست نے اول اول لبیک کہا چنانچہ کتابوں کی خریداری کے لیے نواب حمید اللہ خاں نے دو ہزار روپے عنایت کیے اور زبیدہ و قت

[1] سیرۃ النبی، ج ۱، مقدمہ ص ۵ [2] ایضاً حاشیہ ص ۷۔

نواب سلطان جہاں بیگم فرمانروائے بھوپال نے تدوین سیرت کے لیے دو سو ماہوار منظور کرکے مصارف کی طرف سے علامہ شبلی کو مطمئن کر دیا، انہوں نے اسی موقع پر یہ قطعہ کہا تھا ؎

مصارف کی طرف سے مطمئن ہوں بہر صورت — کہ ابر فیض سلطان جہاں بیگم زرافشاں ہے
رہی تالیف و تنقید روایت ہائے تاریخی — تو اسکے واسطے حاضر مرا دل ہے میری جاں ہے

غرض دو ہاتھ ہیں اس کام کے انجام میں شامل
کہ جس میں اک فقیر بے نوا ہے ایک سلطاں ہے

علمی معاونت کے لیے انہوں نے مولانا حمید الدین فراہیؒ، مولانا سید سلیمان ندویؒ، مولانا عبد السلام ندوی اور مولانا عبد الماجد دریابادی وغیرہ کو منتخب کیا، غرض ہر طرف سے مطمئن ہوکر آستانۂ رسالت میں پہونچے اور ۷؍ جون ۱۹۱۲ء کو انتہائی جوش و سرمستی اور عزم و حوصلہ کے ساتھ سیرۃ النبی کی ابتدا کی، منشی محمد امین زبیری کے نام ایک خط میں لکھتے ہیں :

"ہر حالت میں کام جاری رکھوں گا اور اگر مر نہ گیا اور ایک آنکھ بھی سلامت رہی تو انشاء اللہ دنیا کو ایسی کتاب دے جاؤں گا جس کی توقع کئی سو برس تک نہیں ہو سکتی"[1]

ان کے جذبات اور عزم و حوصلہ کا اندازہ مندرجۂ ذیل قطعہ سے بخوبی لگایا جا سکتا ہے :

فرشتوں میں یہ چرچا ہے کہ حال سرور عالم — دبیر چرخ لکھتا یا کہ خود روح الامین لکھتے
صدا یہ بارگاہ عالم قدوس سے آئی — کہ ہے یہ اور ہی کچھ چیز لکھتے تو ہمیں لکھتے

سیرت نبوی کا خاکہ | اس انتظام کے بعد علامہ شبلی اس عظیم الشان تالیف کے ابتدائی خطوط اور خاکے بنانے میں مصروف ہوئے ایک کے بعد ایک خاکے بنائے، بالآخر جس خاکے پر وہ مطمئن ہوئے اس کا ذکر سیرت کے مقدمہ میں ان کے قلم سے یوں ہے :

---

[1] مکاتیب شبلی، ج ۱ ص ۲۴۲۔

"اس کتاب کے پانچ حصے ہوں گے پہلے حصے میں عرب کے مختصر حالات، کعبہ کی تاریخ اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت سے لے کر وفات تک کے عام حالات اور واقعات و غزوات ہیں، اسی حصہ کے دوسرے باب میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ذاتی اخلاق و عادات کی تفصیل ہے، آل و اولاد اور ازواج مطہرات کے حالات بھی اسی باب میں ہیں۔

دوسرا حصہ منصب نبوت سے متعلق ہے، نبوت کا فرض تعلیم عقائد، اوامر و نواہی اصلاح اعمال و اخلاق ہے، اس بنا پر منصب نبوت کے کاموں کی تفصیل اس حصہ میں کی گئی ہے، اس حصہ میں فرائض خمسہ اور اوامر و نواہی کی ابتدا اور تدریجی تغیرات کی مفصل تاریخ اور ان کے مصالح اور حکم اور دیگر مذاہب سے ان کا مقابلہ و موازنہ ہے، اسی میں نہایت تفصیل سے بتایا گیا ہے کہ عرب کے عقائد اور اخلاق و عادات پہلے کیا تھے اور ان میں کیا کیا اصلاحیں عمل میں آئیں نیز یہ کہ تمام عالم کی اصلاح کے لیے اسلام نے کیا قانون مرتب کیا اور کیونکر وہ تمام عالم کے لیے اور ہر زمانہ کے لیے کافی ہو سکتا ہے۔

تیسرے حصہ میں قرآن مجید کی تاریخ، وجوہ اعجاز اور حقایق و اسرار سے بحث ہے۔

چوتھے حصہ میں معجزات کی تفصیل ہے، قدیم سیرت کی کتابوں میں الگ باب باندھے ہیں لیکن آج کل تو اس کو بالکل مستقل حیثیت سے لکھنے کی ضرورت ہے، کیونکہ معجزات کے ساتھ اصل معجزہ کی حقیقت اور امکان سے بحث کرنے کی بھی ضرورت پیش آئے گی، البتہ جن معجزات کی تاریخ اور سنہ متعین ہے مثلاً معراج یا تکثیر طعام وغیرہ ان کو اس سنہ کے واقعات میں لکھ دیا ہے۔

پانچواں حصہ خاص یورپین تصنیفات کے متعلق ہے، یعنی یورپ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور مذہب اسلام کے متعلق کیا لکھا ہے ؟ مسائل اسلام کے سمجھنے میں ان سے

کیا کیا غلطیاں ہوئیں؟ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اخلاق و عادات یا مسائلِ اسلام پر جو نکتہ چینیاں کی ہیں ان کے جواب[1]۔

اس ضمن میں یہ امر بھی پیشِ نظر رکھنا ضروری ہے کہ علامہ شبلی نے سیرۃ النبی کی تالیف و تدوین اس وقت شروع کی جب ان کی زندگی کی شام ہو چکی تھی، گوناگوں عوارض، صحت کی خرابی، خانگی مسائل، بھائی کی وفات، مخالفین کی سازشیں اور سب سے بڑھ کر قومی و ملی درد نے انہیں چور کر دیا تھا، صحت، خانگی مسائل اور ماحول کی اس ناموافقت و نامساعدت کے باوجود انہوں نے اپنی جان کی بازی لگا کر سیرت نبوی کی تالیف کا کام شروع کیا[2] اور لکھا کہ "سیرت کو جس طرح ہو (گو جان دے کر) پورا کرنا ہے"[3] واقعہ یہ ہے کہ اسی تصنیف پر وہ اپنی زندگی کا خاتمہ بھی چاہتے تھے اور اسے حسن خاتمہ تصور کرتے تھے[4]، وفات سے چند ماہ پیشتر انہوں نے یہ الہامی قطعہ کہا جس کی صداقت اب سب پر آشکارا ہے ؎

عجم کی مدح کی عباسیوں کی داستاں لکھی — مجھے چندے مقیم آستانِ غیر ہونا تھا
مگر اب لکھ رہا ہوں سیرتِ پیغمبرِ خاتم — خدا کا شکر ہے یوں خاتمہ بالخیر ہونا تھا

ہماری علمی تاریخ کا یہ المیہ ہے کہ علامہ شبلی سیرۃ النبی مکمل نہ کر سکے اور دنیا سے اس کی ناتمامی کا داغ لے کر گئے، ان کی تالیف کردہ دو جلدیں ان کی وفات کے وقت مسودہ کی حالت میں طباعت کی منتظر تھیں ۱۹۱۸ء اور ۱۹۲۰ء میں یہ جلدیں شایع ہوئیں، جلد اول کے دیباچہ میں مولانا سید سلیمان ندوی نے بڑی حسرت سے لکھا کہ:

"مصنف اپنی چار سال کی جانکاہ محنت کا ثمرہ خود اپنے ہاتھوں سے قوم کی نذر نہ کر سکا

---

[1] سیرۃ النبی ج ۱، مقدمہ ص ۶۵ - ۶۶ [2] مکاتیب شبلی ج ۱، ص ۲۴۲ [3] ایضاً ص ۳۲۷ [4] ایضاً ج ۲ ص ۲۳۲۔

اور حسن عقیدت کے جو پھول سیکڑوں چمن کدوں سے چن کر اس کے ہاتھ آئے تھے،
ان کو آستانۂ نبوت پر وہ خود نہ چڑھا سکا[1]"

مگر شکر ہے کہ علامہ شبلی نے جو خاکہ مرتب کیا تھا اس میں رنگ بھرنے کے لیے ان کو مولانا سید سلیمان ندوی جیسا لایق شاگرد اور جانشین ملا جنہوں نے بعد کی پانچ ضخیم جلدوں کو حسن و خوبی پورا کیا۔

علامہ شبلی کے قلم سے سیرت کی جو جلدیں نکلی ہیں، آگے بڑھنے سے پہلے ان کے مشمولات و محتویات کا ایک اجمالی جائزہ پیش کیا جا رہا ہے۔

حصہ اول سیرۃ النبی جلد اول طبع جدید ۴۹۷ صفحات پر مشتمل ہے، شروع میں جو مقدمہ ہے پہلا مقدمہ معلومات و مباحث اور قدر و قیمت کے لحاظ سے خود ایک تصنیف کی حیثیت رکھتا ہے اس میں سیرت نبوی کی ضرورت، اہمیت احادیث، سیرت و مغازی اور حدیث کا فرق، سیرت نگاری کی ابتداء و ارتقاء، قدیم و جدید سیرت نگار اور ان کی سیرت نگاری اور ان کی خوبیاں و خامیاں اور ان کے اصول سیرت نگاری کا ذکر ہے، حدیث اور اصول حدیث کا مفصل جائزہ اور مغربی مورخین اور سیرت نگاروں کی تصانیف، ان کی غلط کاریاں اور اس کے اسباب کی تفصیل بیان کی گئی ہے، ان اصولوں کا بھی ذکر کیا گیا ہے جن کا سیرۃ النبی کی تالیف میں خاص اہتمام کیا گیا ہے[2] اس مقدمہ کو ڈاکٹر سید عبداللہ نے عالمانہ تنقید کا شاہکار قرار دیا ہے[3]۔ ڈاکٹر سید شاہ علی نے لکھا ہے کہ سارے اسلامی ادب میں اس مقدمہ کی شاید ہی کوئی مثال مل سکے[4]، اس پر تبصرہ کرتے ہوئے پروفیسر ضیاء الحسن فاروقی لکھتے ہیں:

---

[1] سیرۃ النبی ج ۱، دیباچہ طبع اول، ص ۸ [2] فنِ سیرت نگاری پر ایک نظر، فکر و نظر اسلام آباد اپریل ۱۹۷۶ء، ص ۸۰ [3] اردو میں سوانح نگاری، ص ۲۰۳۔

"اس میں مصنف نے اپنی علمیت، ذہانت، گہرے مطالعہ، تنقیدی صلاحیت اور مورخانہ ژرف نگاہی سے یہ ثابت کردیا ہے کہ سیرت نبویؐ پر قلم اٹھانے کا حق انہیں کا تھا"[1]

دوسرے مقدمہ میں تاریخ عرب قبل از اسلام، عرب کی وجہ تسمیہ اقوام و قبائل کے علاوہ اس عہد کی سیاسی، مذہبی، تہذیبی، معاشرتی اور تمدنی تاریخ قلم بند کی گئی ہے، خانۂ کعبہ کی تعمیر اور اس کی قدامت، نیز حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کے ذبیح ہونے کا تذکرہ بھی ہے، اس دوسرے مقدمہ کو اصل کتاب کا ابتدائی باب بھی سمجھا جاسکتا ہے۔

ان دونوں مقدموں کے بعد کتاب کے آغاز میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا شجرۂ نسب اور آپؐ کے آبا و اجداد کا مختصر احوال ہے، اس کے بعد حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت باسعادت کا ظہور قدسی کے عنوان سے وہ ذکر ہے جس کو اب اردو ادب میں شہ پارے کی حیثیت حاصل ہوچکی ہے، علامہ شبلی کے قلم سے اس میں جس جوش و سرمستی کا اظہار ہوا ہے اس سے یہ تحریر الہام بن گئی ہے۔ فرماتے ہیں:

"چمنستانِ دہر میں بارہا روح پرور بہاریں آچکی ہیں چرخ نادرہ کار نے کبھی کبھی بزم عالم اس سروسامان سے سجائی ہے کہ نگاہیں خیرہ ہوکر رہ گئی ہیں، لیکن آج کی تاریخ وہ تاریخ ہے جس کے انتظار میں پیر کہن سال دہر نے کروڑوں برس صرف کردیے، سیارگانِ فلک اسی دن کے شوق میں ازل سے چشم براہ تھے، چرخ کہن مدت ہائے دراز سے اسی صبحِ جاں نواز کے لیے لیل و نہار کی کروٹیں بدل رہا تھا، کارکنانِ قضا و قدر کی بزم آرائیاں عناصر کی جدت طرازیاں، ماہ و خورشید کی فروغ انگیزیاں، ابر و باد کی تردستیاں، عالم قدس کے انفاس پاک، توحیدِ ابراہیم، جمالِ یوسف، معجز طرازیِ موسیٰ، جاں نوازی

[1] اشخاص و افکار، ص ۱۱۴

مسیح، سب اسی لیے تھے کہ یہ متاع ہائے گراں ارز شاہنشاہ کونین صلی اللہ علیہ وسلم کے دربار میں کام آئیں گے۔

آج کی صبح وہی صبح جاں نواز، وہی ساعت ہمایوں، وہی دور فرخ فال ہے، اربابِ سیر اپنے محدود پیرایۂ بیان میں لکھتے ہیں کہ "آج کی رات ایوان کسریٰ کے ۱۴ کنگرے گر گئے، آتش کدہ فارس بجھ گیا لیکن سچ یہ ہے کہ ایوان کسریٰ نہیں بلکہ شان عجم، شوکت روم، اوج چین کے قصر ہائے فلک بوس گر پڑے، آتش کدۂ فارس نہیں بلکہ جحیم شر، آتش کدہ کفر، آذرکدہ گمرہی سرد ہوکر رہ گئے، صنم خانوں میں خاک اڑنے لگی، بت کدے خاک میں مل گئے، شیرازۂ مجوسیت بکھر گیا، نصرانیت کے اوراق خزاں دیدہ ایک ایک کرکے جھڑ گئے۔

توحید کا غلغلہ اٹھا، چمنستان سعادت میں بہار آگئی، آفتاب ہدایت کی شعاعیں ہر طرف پھیل گئیں، اخلاق انسانی کا آئینہ پرتو قدس سے چمک اٹھا"[1]

ظہور قدسی کے باب میں تاریخ ولادت، اسم گرامی، رضاعت، حلیمہ سعدیہ کی پرورش، رضاعی باپ، بھائی بہن، سفر مدینہ، والدہ ماجدہ کی وفات، دادا عبدالمطلب و چچا ابوطالب کی کفالت، سفر شام اور بحیرا راہب کا قصہ، حرب فجار اور حلف الفضول میں شرکت، تعمیر کعبہ، تجارت اور تجارتی اسفار، تزویج خدیجہؓ، اجتنابِ شرک، موحدین سے ملاقات اور احبابِ خاص کا ذکر ہے۔

اسی حصہ میں "آفتابِ رسالت کا طلوع" کے عنوان سے نبوت کے واقعات ہیں جس میں ہجرت کے پہلے کے تمام واقعات بہ ترتیب لکھے گئے ہیں، اس میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے مراسم جاہلیت، لہو و لعب سے فطری اجتناب، غار حرا کی عبادت، رویائے صادقہ سے نبوت کا

[1] سیرۃ النبی ج ۱، ص ۱۱۴۔

آغاز، پہلی وحی، دعوتِ اسلام کا آغاز اور حضرت ابوبکرؓ کا قبولِ اسلام وغیرہ کا بیان ہے، اس کے بعد قریش کو دین کی دعوت اور ان کی مخالفت و ایذا رسانیوں کا ذکر ہے بعد ازاں حضرت حمزہؓ و حضرت عمرؓ کا قبولِ اسلام، تعذیب مسلمین، مسلمانوں پر ظلم و ستم اور ان کا استقلال، ہجرتِ حبشہ اور نجاشی کے دربار میں حضرت جعفرؓ کی تقریر اور اس کا اثر، واقعہ غرانیق، شعب ابی طالب کی محصوری، حضرت خدیجہؓ اور چچا ابوطالب کی وفات کا بیان ہے، اسی ضمن میں سفرِ طائف، مطعم بن عدی کی پناہ، تبلیغ دین اور کفار کی ایذا رسانیاں، مسلمانوں کی گھبراہٹ اور آپؐ کی تسلی، مدینہ منورہ، انصار اور انصار کی قدیم تاریخ نیز بیعتِ عقبہ اول و ثانی وغیرہ کی تاریخ لکھی گئی ہے۔

سنہ ۱ھ کے ذیل میں ہجرت کے واقعات اور مدینہ منورہ میں قیام کی تفصیل ہے، اسی میں ہجرت کی اجازتِ خداوندی، ہجرت کا ارادہ اور کفار کا محاصرہ اور اس کی ناکامی، غار ثور کی روپوشگی اور کفار کا تعاقب، مدینہ آمد اور اہلِ مدینہ کا جوشِ مسرت، قبا میں نزول اور تعمیر مسجد، پہلی نماز، جمعہ و خطبہ، مسجد نبوی کی تعمیر، ازواج مطہرات کے حجروں کی تعمیر، اذان کی ابتدا، مواخات اور طریقۂ مواخاۃ، انصار کا ایثار، صفہ اور اہل صفہ اور مدینہ کے یہودیوں کے معاہدوں کی تفصیل ہے، اس کے بعد اس سنہ کے متفرق واقعات بھی لکھ دیے گئے ہیں۔

سنہ وار ذکر میں تحویل کعبہ اور اس کے وجوہ، غزوۂ بدر، سویق، احد، بنو قینقاع، بنو نضیر، مریسیع، غزوۂ احزاب، بنو قریظہ وغیرہ کے تمام واقعات کو بیان کیا گیا ہے، اسی میں واقعۂ افک کا بھی بیان ہے، سلسلہ وار ذکر میں حضرت زینبؓ سے نکاح، صلح حدیبیہ، بیعتِ رضوان، سلاطین کو دعوت اسلام، خالد بن ولید اور عمرو بن العاص کا قبولِ اسلام،

فتح خیبر، ادائے عمرہ، غزوۂ موتہ، فتح مکہ، غزوۂ حنین، محاصرۂ طائف، واقعۂ ایلا، غزوۂ تبوک اور حج اکبر کی تمام تاریخی تمدنی اور تہذیبی تفصیلات قلم بند کرنے کے بعد سلسلۂ غزوات پر دوبارہ نظر ڈالی ہے جس سے اسلام کے اصولِ جنگ کی بھی وضاحت ہو جاتی ہے، حصۂ اول کے بارے میں مولانا شاہ معین الدین احمد ندوی نے سچ لکھا ہے کہ:

"ان تمام حالات و واقعات کو خواہ وہ تبلیغ اسلام سے متعلق ہوں یا میدانِ جنگ سے، خانگی زندگی سے متعلق ہوں یا پبلک زندگی سے، پیغمبر کی حیثیت سے ہوں یا عام انسان کی حیثیت سے، دشمنوں سے متعلق ہوں یا دوستوں سے غرض زندگی کے جس شعبے سے تعلق رکھتے ہوں اس طرح پیش کیا ہے کہ جس سے آپؐ کی پیغمبرانہ صداقت اور اخلاقی عظمت پوری طرح نمایاں ہو جاتی ہے اور آپؐ کے خلقِ کریم کو دیکھ کر مخالف بھی آپؐ کی عظمت ماننے پر مجبور ہو جاتا ہے۔"[1]

اس حصہ میں مورخین یورپ کی غلط بیانیوں اور ان کے بے جا اعتراضات کا جا بجا رد و ابطال بھی کیا گیا ہے۔

حصہ دوم | سیرۃ النبیؐ کا دوسرا حصہ طبع جدید ۷۰۵ صفحات پر مشتمل ہے، اس میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی آخری تین سالہ پُر امن زندگی کی تاریخ اور اس عہد زریں کے حالات و واقعات ہیں، شروع میں قیام امن کی کوششوں کا ذکر ہے، اس کے بعد وفودِ عرب کی آمد، قبولِ اسلام، تاسیس حکومتِ الٰہی، مذہبی انتظامات، شریعت کی تاسیس و تکمیل، اسلامی عقائد، عبادات و معاملات، حلال و حرام، حجۃ الوداع اور شریعت کا اعلانِ عام، وفات نبویؐ، تجہیز و تکفین اور متروکات وغیرہ کی تفصیل ہے، اسی میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے شمائل و

---

[1] معارف سلیمان نمبر، ص ۱۸۱۔

معمولات، حلیہ، مہرِ نبوت، گفتگو، لباس، غذا، مرغوبات اور صبح سے شام تک کے معمولات کا بھی ذکر ہے، اس کے بعد مجالسِ نبویؐ، خطابت نبویؐ، عبادات نبویؐ، اخلاق نبویؐ، ازواجِ مطہرات اور ان کے ساتھ برتاؤ اور اولاد وغیرہ عنوانات کے تحت بے شمار حالات و واقعات کے ذریعہ اس عہد زریں کی مرقع کشی کی گئی ہے جس سے آپؐ کی پیغمبرانہ شان اور اخلاقی عظمت پوری طرح نمایاں ہوگئی ہے۔

اس دوسرے حصہ کی تکمیل سے پہلے ہی علامہ شبلی سفر آخرت پر روانہ ہوگئے، اس لیے مولانا سید سلیمان ندوی نے اس کی تکمیل اپنے بعض اضافوں کے ذریعہ کی، ان اضافوں کی نشاندہی کرتے ہوئے ڈاکٹر انور محمود خالد لکھتے ہیں:

• جلد دوم میں سید سلیمان ندوی نے اصل متن میں جو اضافے کیے ہیں وہ کتاب میں قیامِ امن، تبلیغ و اشاعت اسلام تا سنہ ھ حکومتِ الٰہی کے عنوان کے تحت شامل ہیں، علاوہ ازیں مذہبی انتظامات، تکمیل شریعت، عقائد، عبادات معاملات اور حلال و حرام کے مباحث میں بھی سید صاحب نے معتد بہ اضافے کیے ہیں، سالِ آخر (سنہ ھ) سالِ وفات، متروکات اور شمائل نبوی وغیرہ میں سید صاحب نے کسی خاص اضافہ کی ضرورت محسوس نہیں کی، لیکن خطابت نبوی اور عبادات نبویؐ کے ابواب مکمل طور پر اور معمولات نبوی اور مجالس نبویؐ کے ابواب کافی حد تک سید سلیمان ندوی کے تحریر کردہ ہیں، اخلاقِ نبویؐ کے طویل باب میں استاذ و شاگرد دونوں کا اشتراک ہے، البتہ آخری تینوں ابواب (آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ازواج و اولاد) میں شاگرد نے کوئی تبدیلی نہیں کی ہے[1]۔

تحسین و تنقید سیرۃ النبیؐ کا غلغلہ اس کے وجود میں آنے سے پہلے ہی پورے ملک میں بلند

[1] اردو نثر میں سیرت رسولؐ، ص ۵۵۰۔

ہو چکا تھا اور ہر شخص کی نگاہ سیرۃ النبیؐ پر لگی ہوئی تھی، چنانچہ جب سیرۃ النبیؐ طبع ہو کر آئی تو ہاتھوں ہاتھ لی گئی اور اپنے اپنے ظرف کے پیمانوں میں ناپی گئی، بحیثیت مجموعی اہل علم کا یہ اعتراف ہے کہ آج تک اس موضوع پر سیرۃ النبیؐ جیسی معیاری اور بلند پایہ کتاب دنیا کی کسی زبان میں نہیں لکھی جا سکی ہے۔

اس اعتراف عام اور خراج و تحسین کے باوجود اس پر متعدد اعتراضات بھی کیے گئے ہیں ان اعتراضات کو معاندانہ اور غیر معاندانہ دو حصوں میں بانٹا جا سکتا ہے۔

معاندانہ تنقید علامہ شبلی نے جب سیرت نبویؐ کی تالیف کا اعلان کیا تو بقول مولانا سید سلیمان ندویؒ "ہر طرف سے مسلمانوں نے اس کو لبیک کہا" مگر ایک آواز اس کے خلاف بھی آئی، مولوی انشاء اللہ خاں ایڈیٹر وطن لاہور نے لکھا کہ "چونکہ قاضی محمد سلیمان منصور پوری اس کے لکھنے کا ارادہ کر چکے ہیں اس لیے مولوی شبلی کو تکلیف کی ضرورت نہیں"[1] ظاہر ہے سیرت کے لیے یہ اعلان کس درجہ غلط اور مضحکہ خیز ہے؟ اس موقع پر سرسید احمد خاں کا یہ قول بھی حد درجہ برمحل اور معنی خیز ہے کہ "اگر ایک ہی موضوع پر دس شخص بھی لکھیں تو مولوی شبلی کی تحریر نرالی ہوگی"[2]، سرسید نے اپنی یہ رائے سیرۃ النبیؐ کی تالیف سے پہلے ظاہر کی تھی، بہرحال مولوی انشاء اللہ خاں کی نامناسب اور ضعیف آواز علامہ شبلی کے عزم و حوصلہ کے سامنے گرد ثابت ہوئی مگر بعض لوگ ایسے بھی تھے جن کو یہ بات پسند نہ تھی کہ فرمانروائے بھوپال کی سرپرستی میں سیرت نبویؐ پر جو کتاب لکھی جائے وہ علامہ شبلی کے قلم سے ہو اور وہ بقول مولانا سید سلیمان ندویؒ "اس کے منتظر تھے کہ سیرت نبویؐ کا کوئی صفحہ منظر عام پر آئے اور وہ اعتراضوں کی بوچھاڑ کر دیں"[3]۔

[1] دیباچہ رحمۃ للعالمین، حصہ سوم، ص، [2] بحوالہ حیات شبلی، ص ۲۲۵ [3] حیات شبلی، ص ۱۷۔

مولانا شبلی کی خواہش کے مطابق مولانا ابوالکلام آزاد نے مقدمہ سیرت کو الہلال میں اس مقصد سے شایع کیا کہ ارباب نظر دیکھ لیں کہ کتاب کس قدر تحقیق و تنقید اور تدقیق سے لکھی گئی ہے، انہوں نے یہ درخواست بھی کی کہ اہل علم بحث و مذاکرہ سے دریغ نہ کریں اور سیرت و تاریخ سے دلچسپی رکھنے والے علماء اپنے مفید مشورے دفتر سیرت یا الہلال تک پہونچائیں[1] اس سلسلہ میں دو مراسلے شایع ہوئے، ایک مراسلہ حکیم غلام غوث صاحب بھاولپوری کا تھا[2] اور دوسرا مولوی محمد اسحاق صاحب مدرس مدرسہ عالیہ کلکتہ نے لکھا تھا[3]، ان کے علاوہ کسی نے اس مذاکرۂ علمی میں حصہ نہیں لیا، مولانا آزاد نے اس پر اپنے تاسف کا بھی اظہار کیا[4] حالانکہ حکیم غلام غوث بھاولپوری نے علمائے دیوبند سے بھی اس میں حصہ لینے کی درخواست کی تھی[5]، مگر معاندانہ طرزِ عمل رکھنے والوں نے اس علمی انداز کے بجائے دوسرا غیر علمی رُخ اختیار کیا، چنانچہ مولوی عبدالشکور صاحب ایڈیٹر النجم نے مقدمۂ سیرت پر اپنے نقطۂ نظر سے سخت تنقید کی، مخالفین نے جس میں دیوبند کے لوگ بھی شامل تھے اس تنقید کو دستاویز بنا کر بیگم بھوپال تک پہنچایا تاکہ سیرت کی امداد بند ہو جائے، مخالفین کے اس معاندانہ طرزِ عمل کا اندازہ بیگم بھوپال کو بھی ہو گیا کہ چند مولویوں کی معاندانہ حرکتیں ہیں، اس لیے امداد جاری رہی مگر مخالفین نے بھی اپنی حرکتیں جاری رکھیں، مصنف کو فتویٰ کفر سے نوازا گیا، یہانتک کہ مسودہ سیرت کے سرقہ کی بھی کوشش کی گئی[6]

---

[1] الہلال، مورخہ ۲۲ جنوری ۱۹۱۳ء ص ۸ [2] الہلال، ۳۰ اپریل ۱۹۱۳ء، بعنوان سیرتِ نبویؐ [3] الہلال، ۲۱ و ۲۸ مئی ۱۹۱۳ء بعنوان سیرتِ نبویؐ اور نقدِ روایات و آثار [4] الہلال ۳۰ اپریل ۱۹۱۳ء، ص ۱۰ [5] ایضاً [6] مکاتیب شبلی، ج ۱، ص ۲۰۹ - ۲۱۰ و ج ۲، ص ۱۶۱۔

گو سرکار عالیہ کی خواہش تھی کہ معاندین کی ان تنقیدوں کا بھی جواب لکھا جائے مگر علامہ شبلی چونکہ ان اعتراضات کو مہمل اور معاندانہ تصور کرتے تھے[1] اس لیے ان کا جواب بھی دینا نہیں چاہتے تھے ہاں ان کی یہ خواہش تھی کہ مسودۂ سیرت کسی عالم کے پاس بھیج دیا جائے تاکہ وہ دیکھ کر اپنی رائے دیں تاکہ ملک کے اعتماد کا باعث ہو، اس سلسلہ میں خود انہوں نے مولانا محمود حسن صاحب کا نام پیش کیا اور ان کی خدمت میں بھی اپنی خواہش پیش کی، مگر اس خواہش کا جو انجام ہوا وہ علامہ شبلی کی زبانی ملاحظہ ہو:

> "آج ان کا (مولانا عبید اللہ سندھی) خط آیا کہ وہ گئے، لیکن دیوبند پارٹی کو بھوپال سے اطلاع مل چکی تھی، ان لوگوں نے مولوی محمود حسن صاحبؒ کو باز رکھا کہ وہ مسودے کا سرے سے دیکھنا ہی منظور نہ کریں، دیوبند کے خیالات سے مولوی محمود حسن صاحب فی نفسہٖ الگ ہیں، چنانچہ مولوی عبید اللہ سندھی کو ان لوگوں نے کافر بنا دیا، لیکن مولوی محمود حسن صاحب سے ان کے تعلقات اب تک وہی ہیں، بہرحال اب غور کرنا چاہیے کہ کیا کیا جائے، چونکہ مولویوں نے ایک جتھا بنا لیا ہے اس لیے سر دست اور کوئی مولوی مسودہ دیکھنے کی ذمہ داری اپنے سر نہ لے گا ورنہ سمجھے گا کہ برادری سے خارج ہونا پڑے گا"[2]

سیرۃ النبی شاید اردو کی پہلی ایسی تالیف ہے جس کے مصنف پر قبل از اشاعت اس قسم کا دباؤ ڈالا گیا، معاندین کے اعتراضات ہمیں دستیاب نہ ہو سکے، مولانا شبلی کے ایک خط سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان لوگوں نے علامہ شبلی پر بخاری و مسلم کی روایتوں کو ضعیف ثابت کرنیکا الزام عائد کیا تھا، مگر مولانا نے اس کی تردید کی ہے[3]

(باقی)

---

[1] مکاتیب شبلی، ج ۱، ص ۲۵۶ [2] ایضاً ص ۲۶۰ [3] ایضاً ص ۲۶۱۔

استدراک

از جناب وارث ریاضی صاحب، مغربی چمپارن

اگست اور ستمبر ۱۹۹۶ء کے معارف میں ڈاکٹر محمد یاسین مظہر صدیقی ندوی صاحب کا مقالہ "ملفوظاتِ اقبال کی ادبی اہمیت" باصرہ نواز ہوا۔ اس کے کچھ مندرجات خاکسار کے نزدیک محلِ نظر ہیں۔ پہلے یہ عرض کرنا ہے کہ ڈاکٹر صدیقی صاحب کا خیال ہے کہ علوم عصری کی طرح علوم اسلامی پر بھی ڈاکٹر اقبالؒ کی نظر گہری تھی۔ ملاحظہ ہو:

"قرآنیات، حدیث، فقہ، قانون، کلام، فلسفہ، منطق، سماجیات، معاشیات، ادب، تہذیب غرضیکہ وہ کون سا موضوع ہے جو ان کی گرفت یا دسترس سے باہر ہے، تبحر علمی اور وسعتِ معلومات کا ایک بحر ناپیدا کنار ہے جو ہر آن ٹھاٹھیں مارتا نظر آتا ہے"[1]

گویا اقبالؒ عصری علوم کی طرح اسلامی علوم میں بھی نہ صرف ماہر بلکہ نابغۂ روزگار تھے۔ میرے خیال میں بیک وقت ایک عظیم شاعر اور فلسفی ہونے کی حیثیت سے اقبال کا چاہے جتنا بھی بلند مقام ہو لیکن ان کی شاعری اور فلسفہ کو ایک دوسرے سے الگ کرکے دیکھا جائے تو اقبال کے معاصر شعراء میں اکبر الٰہ آبادی، مولانا سیماب اکبرآبادی، شاد عظیم آبادی، مولانا حسرت موہانی اور مولانا اقبال سہیل وغیرہ اقبال سے کم درجہ کے شاعر نہیں تھے، اسی طرح اقبال کے ہم عصر اربابِ علم و دانش میں ایسی شخصیتیں موجود تھیں جو اقبال سے کم عظیم المرتبت

نہیں تھیں۔

اقبالؒ کے علم و فضل کے متعلق عالم اسلام کے عظیم مفکر اور ماہر اقبالیات حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی مدظلہ کا موقف بھی ڈاکٹر صدیقی صاحب کے نقطۂ نظر سے مختلف ہے، حضرت علی میاں صاحب رقمطراز ہیں:

"میں اقبالؒ کو کوئی معصوم و مقدس ہستی اور کوئی دینی پیشوا اور امام مجتہد نہیں سمجھتا اور نہ میں ان کے کلام سے استناد اور مدح سرائی میں حد افراط کو پہونچا ہوا ہوں، جیسا کہ ان کے غالی معتقدین کا شیوہ ہے، میں سمجھتا ہوں کہ حکیم سنائیؒ، عطارؒ اور عارف رومیؒ، آداب شریعت کے پاس اور لحاظ اور ظاہر و باطن کی یک رنگی اور دعوت و عمل کی ہم آہنگی میں ان سے بہت آگے ہیں۔ اقبال کے یہاں اسلامی عقیدہ و فلسفہ کی ایسی تعبیریں بھی ملتی ہیں جن سے اتفاق کرنا مشکل ہے، میں بعض پُرجوش نوجوانوں کی طرح اس کا بھی قائل نہیں کہ اسلام کو ان سے بہتر کسی نے سمجھا ہی نہیں اور اس کے علوم و حقایق تک ان کے سوا کوئی پہونچا ہی نہیں، بلکہ سچ تو یہ ہے کہ میں اپنی زندگی کے ہر دور میں اس کا قائل رہا کہ وہ اسلامیات کے ایک مخلص طالب علم رہے اور اپنے مقتدر معاصرین سے برابر استفادہ ہی کرتے رہے۔ ان کی نادر شخصیت میں بعض ایسے کمزور پہلو بھی ہیں جو ان کے علم و فن اور پیغام کی عظمت سے میل نہیں کھاتے ...... ان کے مدراس کے خطبات میں ...... بہت سے ایسے خیالات و افکار ملتے ہیں جن کی تاویل و توجیہ اور اہلِ سنت کے اجتماعی عقائد سے مطابقت شکل ہی سے کی جاسکتی ہے۔ یہی احساس استاد محترم مولانا سید سلیمان ندویؒ کا تھا"[2]

اقبالیات پر گہری نظر رکھنے والے اصحابِ علم اس حقیقت سے اچھی طرح واقف ہیں کہ ڈاکٹر اقبال نے عرصۂ دراز تک قرآن، حدیث، فقہ اور دیگر اسلامی علوم میں مولانا انور شاہ کشمیری،

علامہ سید سلیمان ندویؒ اور امام الہند مولانا ابوالکلام آزادؒ وغیرہ سے بذریعہ مراسلت استفسار کرکے اپنے علم اور معلومات میں اضافہ کیا۔ پروفیسر کلیم اختر نے مولانا انور شاہ کشمیریؒ اور علامہ اقبال کے مابین مراسلت کا تذکرہ کرتے ہوئے استاد محترم مولانا قاری محمد طیبؒ کے حوالے سے لکھا ہے:

"اقبال کے آٹھ آٹھ صفحات کے خطوط، سوالات و شبہات سے پُر آتے تھے۔ حضرت (مولانا انور شاہؒ) ان کے شافی جواب لکھتے تھے۔"

۱۹۲۶ء میں اورینٹل کالج لاہور کے شعبۂ عربی و فارسی کے صدارتی خطبہ میں اقبالؒ نے تحریر فرمایا تھا:

"جدید ریاضیات کے اہم ترین تصورات میں سے ایک تصور کا یہ مختصر حوالہ بالا میرے ذہن کو عراقی کی تصنیف "غایۃ الامکان فی درایۃ المکان" کی طرف منتقل کر دیتا ہے۔ مشہور حدیث لاتسبوا الدھر لان اللہ ھو الدھر میں دہر (عقبی TIME) کا جو لفظ آیا ہے اس کے متعلق مولوی انور شاہ صاحب سے جو دنیائے اسلام کے جید ترین محدثینِ وقت میں سے ہیں، ان سے میری خط و کتابت ہوئی، اس مراسلت کے دوران میں مولانا موصوف نے مجھے اس مخطوطہ کی طرف رجوع کرایا اور بعد ازاں میری درخواست پر ازراہِ عنایت مجھے اس کی ایک نقل ارسال کی۔"

مولانا سید سلیمان ندویؒ کے نام ڈاکٹر اقبالؒ کے مکاتیب پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ نہ صرف اسلامی علوم بلکہ شعر و ادب میں بھی مولانا سید سلیمان ندویؒ سے اقبال استفسار فرماتے تھے۔

اسلامی علوم میں مولانا سید سلیمان ندویؒ سے فیضیاب ہونے کو اپنے لیے باعث خیر و برکت تصور کرتے تھے، چنانچہ سید صاحبؒ کے نام ۲۴ اپریل ۱۹۲۶ء کے مکتوب میں اقبالؒ رقم طراز ہیں:

"آپ اپنے نوازش نامہ کی طوالت کے لیے عذر خواہی کرتے ہیں مگر میرے لیے یہ طویل خط باعثِ خیر و برکت ہے، اللہ تعالیٰ آپ کو جزائے خیر دے، میں نے اسے کئی دفعہ پڑھا اور گزشتہ رات چودھری غلام رسول مہر سے بھی پڑھوا کر سُنا اور احباب بھی اس مجلس میں شریک تھے۔ اگر میری نظر اس قدر وسیع ہوتی جس قدر آپ کی ہے تو مجھے یقین ہے کہ میں اسلام کی کچھ خدمت کر سکتا۔ فی الحال انشاء اللہ آپ کی مدد سے کچھ نہ کچھ لکھ سکوں گا۔"

امریکہ کی مشہور یونیورسٹی کولمبیا کی طرف سے ایک انگریز کی شایع شدہ کتاب "مسلمانوں کے نظریات متعلقہ مالیات" میں اس اظہار خیال پر کہ "اجماع، نص قرآنی کو منسوخ کر سکتا ہے" اقبالؒ ۸ اگست ۱۹۲۴ء کے مکتوب میں حضرت سید صاحب علیہ الرحمہ کو لکھتے ہیں:

"اس کتاب میں لکھا ہے کہ اجماع امت، نص قرآنی کو منسوخ کر سکتا ہے، یعنی یہ کہ مثلاً مدت شیرخوارگی جو نصِ صریح کی رو سے دو سال ہے، کم یا زیادہ ہو سکتی ہے یا حصص شرعی، میراث میں کمی بیشی کر سکتا ہے۔ مصنف نے لکھا ہے کہ بعض حنفاء اور معتزلیوں کے نزدیک اجماع امت یہ اختیار رکھتا ہے۔ مگر اس نے کوئی حوالہ نہیں دیا۔ آپ سے دریافت طلب ہے کہ آیا مسلمانوں کے فقہی لٹریچر میں کوئی ایسا حوالہ موجود ہے؟

امر دیگر یہ ہے کہ آپ کی ذاتی رائے اس بارے میں کیا ہے؟ میں نے ابوالکلام صاحب کی خدمت میں بھی عریضہ لکھا ہے، میں آپ کا بڑا ممنون ہوں گا اگر جواب جلد دیا جائے۔"

مذکورہ بالا تصریحات سے خود ڈاکٹر اقبالؒ کے مکتوبات کے حوالہ سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ اسلامی علوم میں اقبالؒ کی نظر گہری نہیں تھی جیسا کہ ان کے غالی معتقدین تصور

کرتے ہیں۔ عظیم فیروز آبادی کا یہ خیال بالکل درست ہے کہ:

"قرآن وحدیث اور دیگر جدید علوم کا براہِ راست مطالعہ کرنے کے بجائے انہوں (اقبالؒ) نے سید سلیمان ندویؒ اور دیگر علماء سے استفسار کرکے اپنی معلومات کی کمی کو پورا کرنا مناسب سمجھا"۔[۸]

ڈاکٹر صدیقی کا یہ خیال بھی محلِ نظر ہے کہ "ٹھیٹ علمائے کرام اور فقہائے عظام اقبال کے بعض فرمودات اور معتقدات سے مطمئن و متفق نہیں ہیں"۔[۹]

مقالہ نگار خود ایک جید عالمِ دین اور بالغ نظر دانشور ہیں۔ کیا وہ اقبالؒ کے اس خیال سے مطمئن ہیں کہ روس کا سابق صدر "اسٹالن" مسلمان تھا؟ اقبالؒ اپنے بھائی عطا محمد کو لکھتے ہیں:

"..... اس سے زیادہ معنی خیز خبر یہ ہے کہ روس کی سلطنت کا صدر اب ایک مسلمان محمد اسٹالن ہے"۔[۱۰]

ڈاکٹر صدیقی کیا اس بات سے متفق ہیں کہ نبوتِ محمدیہ کی معنوی حیثیت اور اس کی کنہ کو اقبالؒ کے سوا کسی نے نہیں سمجھا۔ خواجہ عبدالحمید ۴ جولائی ۱۹۳۵ء کی ڈائری میں تحریر فرماتے ہیں:

"حضرت علامہ (اقبال) کی تمام گفتگو بڑے دقیق فلسفیانہ موضوعات پر تھی۔ آپ نے نبوت پر عموماً اور نبوت محمدیہ پر خصوصی روشنی ڈالی۔ حضرت علامہ کا پختہ خیال ہے کہ نبوت محمدیہ کی معنوی حیثیت کو ابھی تک انسان نہیں سمجھا۔ ان کا یہ بھی دعویٰ ہے کہ بعض بزرگانِ سلف بھی اس کی کنہ کو نہیں پہونچے۔ وہ مدعی تھے کہ خود ان کو اس حقیقت کو سمجھنے کی توفیق حاصل ہوئی ہے اور اس موضوع پر وہ تفصیل سے اپنی مجوزہ کتاب تمہید القرآن میں روشنی ڈالیں گے"۔[۱۱]

ڈاکٹر صدیقی لکھتے ہیں:

"حضرت اقبال کو سرسید کے سیاسی نقطۂ نظر، قومی سیاست میں موقف اور مسلم قومی سیاسی تحریک سے اتفاق تھا جبکہ نیشنلسٹ علماء اور قوم پرست مسلمانوں کو ان سے اختلاف حضرت علامہ کے ارشادات میں اس موضوع پر بہت زیادہ مواد ہے اور اسی کے ساتھ مولانا مدنی کی سیاست اور ان کے طرزِ فکر سے اختلاف بھی ہے"۔[۱۲]

قومی سیاست میں مولانا حسین احمد مدنی علیہ الرحمہ کا نظریہ سرسید مرحوم کے نظریۂ قومیت سے قطعاً مختلف نہیں ہے، اس لیے سرسیدؒ کے نظریۂ قومیت سے ڈاکٹر اقبالؒ کے اتفاق اور مولانا مدنیؒ کے نظریہ سے اختلاف کرنے کی بات سمجھ سے بالاتر ہے۔ سرسیدؒ کے نزدیک کل ہندوستانی ایک قوم ہیں، چنانچہ وہ فرماتے ہیں:

"قوم کا اطلاق ایک ملک کے رہنے والوں پر ہوتا ہے۔ یاد رکھو کہ ہندو اور مسلمان ایک مذہبی لفظ ہے۔ ورنہ ہندو، مسلمان اور عیسائی جو اس ملک کے رہنے والے ہیں اس اعتبار سے سب ایک قوم ہیں۔ جب یہ سب گروہ ایک قوم کہے جاتے ہیں تو ان سب کو ملکی فائدے میں جو ان سب کا ملک کہلاتا ہے ایک ہونا چاہیے، اب وہ زمانہ نہیں ہے کہ صرف مذہب کے خیال سے ایک ملک کے باشندے دو قومیں سمجھی جائیں"۔[۱۳]

اس طرح کی تحریریں سرسید کے یہاں اور بھی ملتی ہیں اور ان سے ان کا جو نظریۂ قومیت ثابت ہوتا ہے اس سے ڈاکٹر اقبالؒ کو اتفاق تھا۔ آئیے اب یہ دیکھیں کہ قومی سیاست میں مولانا حسین احمد مدنی کا موقف کیا تھا؟ ۸ جنوری ۱۹۳۸ء کو صدر بازار دہلی کے اجلاس میں آزادیٔ وطن کے لیے ہندو مسلم اتحاد عمل پر زور دیتے ہوئے اس زمانہ کے رائج نظریۂ قومیت کے سلسلہ میں مولانا مدنی نے فرمایا تھا:

"موجودہ زمانہ میں قومیں اوطان سے بنتی ہیں، نسل یا مذہب سے نہیں، دیکھو انگلستان کے

بسنے والے سب ایک قوم شمار کیے جاتے ہیں، حالانکہ ان میں یہودی بھی ہیں، نصرانی بھی، پروٹسٹنٹ بھی ہیں اور کیتھولک بھی، یہی حال امریکہ، جاپان اور فرانس وغیرہ کا ہے۔"[14]

غور فرمائیے سرسید کے نظریۂ قومیت (جس سے اقبالؒ کو اتفاق تھا) سے ہٹ کر مولانا مدنی نے وہ کونسی قابلِ اعتراض بات کہہ دی جو اقبالؒ کے نزدیک موردِ عتاب ہے؟

یہاں اس بات کی وضاحت ضروری ہے کہ استخلاصِ وطن کے لیے ہندو مسلم سیاسی اشتراکِ عمل کا نظریہ جسے مولانا مدنیؒ "متحدہ قومیت" سے تعبیر کرتے ہیں، یہ مولانا مدنیؒ کا کوئی مخصوص سیاسی نظریہ نہیں تھا، بلکہ آزادیٔ وطن کے مختلف مراحل ہیں، ہندوستان کے عظیم علمائے کرام نے ہندو مسلم سیاسی اشتراکِ عمل کو جائز قرار دیا تھا۔ ۱۹۱۲ء میں "مسلم گزٹ" (لکھنؤ) میں علامہ شبلی نعمانی علیہ الرحمہ نے "مسلمانوں کی پولٹیکل کروٹ" کے عنوان سے کئی قسطوں میں جو مضمون لکھا تھا، اس میں انہوں نے ہندو مسلم سیاسی مصالحت پر تفصیل سے اظہارِ خیال فرمایا تھا، مولانا شبلیؒ نے اس مضمون میں نواب وقار الملک بہادر کے اس نقطۂ نظر سے کہ "مسلمان کانگریس میں شرکت کریں گے تو ان کی ہستی فنا ہو جائے گی"، اختلاف کرتے ہوئے تحریر فرمایا تھا:

"اگر پارسیوں کی قوم ایک لاکھ کی جماعت کے ساتھ ہندوؤں کے ۱۹ کروڑ اور مسلمانوں کے پانچ کروڑ افراد کے مقابلہ میں اپنی ہستی قائم رکھ سکتی ہے، اگر دادا بھائی نوروزجی تمام ہندوستان کے مقابلہ میں سب سے پہلے پارلیمنٹ کا ممبر ہو سکتا ہے، اگر گوکھلے تنہا ریفارم اسکیم کی عظیم الشان تحریک کی بنیاد ڈال سکتا ہے تو ۵ کروڑ مسلمانوں کو اپنی ہستی کے مٹ جانے کا اندیشہ نہیں کرنا چاہیے۔"[15]

مولانا شبلیؒ نے مذکورہ مضمون میں ہندو مسلم اتحاد پر بحث کرتے ہوئے لکھا تھا کہ مغلوں کے دورِ حکومت میں جو ہندو مسلم مصالحانہ اتحاد، باہمی محبت اور رواداری پیدا ہوئی تھی وہ اب بھی

ممکن ہے۔[16]

نومبر ۱۹۱۹ء میں جمعیۃ علمائے ہند کا قیام عمل میں آیا۔ جمعیۃ کے اکابر علماء نے جمعیۃ کے قیام کے روزِ اول ہی سے آزادیٔ وطن کے لیے ہندو مسلم سیاسی اشتراکِ کار کو نہ صرف جائز بلکہ ضروری قرار دیا۔[17]

• جمعیۃ علمائے ہند کا اجلاس دوئم نومبر ۱۹۲۰ء میں دہلی میں منعقد ہوا تھا جس میں پانچ سو علماء نے شرکت کی تھی۔ اس اجلاس میں حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن قدس سرہ العزیز کی طرف سے جو خطبۂ صدارت پیش کیا گیا اس میں حضرت شیخ الہندؒ نے آزادیٔ وطن کے لیے ہندو مسلم سیاسی اشتراک و اتحاد کو جائز قرار دیا تھا۔ انھوں نے لکھا تھا:

"کچھ شبہ نہیں کہ حق تعالیٰ شانہٗ نے آپ کے ہم وطن اور ہندوستان کے سب سے زیادہ کثیر التعداد قوم (ہنود) کو کسی نہ کسی طریق سے آپ کے ایسے پاک مقصد کے حصول میں موید بنا دیا ہے اور میں ان دونوں قوموں کے اتفاق و اتحاد کو بہت مفید اور نتیجہ خیز سمجھتا ہوں اور حالات کی نزاکت کو محسوس کر کے جو کوشش اس کے لیے فریقین کے عماید نے کی ہے اور کر رہے ہیں اس کے لیے میرے دل میں بہت قدر ہے۔ کیونکہ میں جانتا ہوں کہ صورتِ حال اگر اس کے مخالف ہوگی تو وہ ہندوستان کی آزادی کو ہمیشہ کے لیے ناممکن بنا دے گی۔"[18]

جمعیۃ علمائے ہند کا ساتواں اجلاس زیرِ صدارت حضرت مولانا سید سلیمان ندویؒ مارچ ۱۹۲۶ء میں بمقام کلکتہ منعقد ہوا تھا۔ حضرت سید صاحبؒ نے خطبۂ صدارت میں تحریر فرمایا تھا:

"ہندوستان کے ہر طبقہ کے مسلمانوں کو یہ حقیقت پیشِ نظر رہنی چاہیے کہ آیندہ

ہندوستان کی جو شکل وصورت بھی ہو، بہرحال یہاں کی حکومت اسلامی نہ ہوگی، بہتر سے بہتر جو صورت خیال میں آسکتی ہے وہ ایک متحدہ جمہوریت کی ہے۔[۱۹]

علاوہ ازیں مولانا مدنیؒ کے نظریۂ قومیت پر جب ڈاکٹر اقبالؒ نے اعتراض کیا تو مولانا سید سلیمان ندویؒ نے اپنے مضمون "قوم و وطن" میں مولانا مدنیؒ کے موقف کی تائید کرتے ہوئے تحریر فرمایا:

"ان اوپر کی سطروں کی بنا پر ڈاکٹر (اقبال) صاحب کی پیش نظر قوم، ملت اور امت کی جو تشریح ہے وہ فلسفیانہ اصطلاحوں میں صحیح ہو تو ہو مگر قرآن کے لفظوں میں میرے خیال میں صحیح نہیں ہے"[۲۰]

جمعیۃ کا آٹھواں اجلاس پشاور میں علامہ انور شاہ کشمیریؒ کی صدارت میں ہوا تھا۔ حضرت شاہ صاحبؒ نے اپنے خطبۂ صدارت میں لکھا تھا کہ ملک کی آزادی کے لیے غیر مسلم فرقوں کے ساتھ اشتراکِ کار کے لیے معاہدہ کیا جاسکتا ہے اور انہوں نے معاہدہ کی شرعی اساس کے لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس معاہدہ کا ذکر کیا تھا جو معاہدہ آپؐ نے مدینہ منورہ کے تحفظ کے لیے یہود سے کیا تھا۔[۲۱]

پروفیسر عبد المغنی نے مولانا آزادؒ کے تصور قومیت پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھا ہے کہ سنہ ۱۹۲۳ء تک مولانا آزادؒ نے اس مسئلہ پر جو کچھ اظہار خیال فرمایا اس کا ماحصل یہ تھا:

"ملتِ اسلامیہ ایک مستقل وجود رکھتی ہے اور اس کی تنظیم و ترقی ہمیشہ اس کے اپنے اصولوں کی بنیاد پر ہوگی لیکن اس تنظیم و ترقی کو فروغ اسی وقت ہوگا جب ملک آزاد ہوجائے، ملک کی آزادی کے لیے فرقہ وارانہ اتحاد اور متحدہ تحریک ضروری ہے، یہ تحریک سیاسی میدان میں ایک متحدہ قومیت کی بنیاد پر چلائی جاسکتی ہے اور کامیاب ہوسکتی ہے"[۲۲]

تعجب ہے کہ سر سید مرحوم کے "نظریۂ قومیت" اور جنگ آزادی کے مختلف مراحل میں مذکورہ بالا علمائے کرام کے پیش کردہ "سیاسی نقطۂ نظر" سے ڈاکٹر اقبالؒ نے کوئی اختلاف نہیں کیا۔ البتہ مولانا آزادؒ کے نظریۂ وطن کو اسلام کے سیاسی نقطۂ نظر کے خلاف قرار بھی دیا تو اپنی مخصوص مجلسوں میں اور وہ بھی دبی زبان سے۔ مولانا آزادؒ کے خلاف نظم یا نثر میں کچھ اظہار خیال نہیں فرمایا لیکن مولانا حسین احمد مدنیؒ نے اس وقت جبکہ آزادی کی جنگ فیصلہ کن مرحلہ میں داخل ہو رہی تھی اپنا سیاسی موقف (جو دراصل مذکورۂ بالا علماء کے سیاسی نقطۂ نظر کی صدائے بازگشت ہے) پیش کیا تو ان کے خلاف یہ پروپگنڈہ کیا گیا کہ "مولانا حسین احمد مدنیؒ نے اپنی تقریر میں کہا ہے کہ مذہب و ملت کا مدار وطنیت پر ہے اس لیے ہندوستانی مسلمانوں کو چاہیے کہ اپنی قومیت کی بنیاد وطن کو بنائیں" اور اس غلط پروپگنڈہ سے متاثر ہوکر اقبالؒ نے مولانا مدنیؒ کے خلاف اپنے مشہور تین اشعار میں اعتراض کرکے پورے ملک میں ایک ہنگامہ برپا کردیا۔

حقیقتِ حال سے واقفیت کے بعد ڈاکٹر اقبالؒ نے مولانا مدنیؒ کے خلاف اپنا اعتراض واپس لے کر ان اشعار کو کالعدم قرار دے دیا، لیکن اقبالؒ کی وفات کے بعد ایک منظم سازش کے تحت آنے والی نسلوں کو گمراہ کرنے کے لیے ان اشعار کو "ارمغانِ حجاز" میں شایع کردیا گیا۔ مولانا مدنیؒ کے خلاف ڈاکٹر اقبالؒ کے اشعار "ارمغانِ حجاز" میں شامل کیے جانے کے سلسلہ میں شورش کشمیری مرحوم رقمطراز ہیں:

"اشعار بالا ارمغان حجاز کے آخر میں درج ہیں۔ علامہ اقبالؒ نے ۲۱ اپریل ۱۹۳۸ء کو انتقال فرمایا۔ ارمغان حجاز نومبر ۱۹۳۸ء میں شایع ہوئی، علامہ اقبال زندہ ہوتے اور ارمغانِ حجاز ان کی ترتیب و تدوین سے شایع ہوتی تو یہ اشعار اس میں کبھی نہ ہوتے۔ علامہ

اقبال مرحوم "شخصیات" کی مدح و قدح سے بلند و بالا تھے اور عمر کے آخری دور میں یہ چیزیں ان کے تصور ہی سے عنقا ہو چکی تھیں، انہوں نے اس طرز کے تمام اشعار اپنے کلام سے ہمیشہ کے لیے خارج کر دیے۔ اگر مرتبین اتنے ہی دیانتدار تھے تو انہیں کم سے کم مولانا محمد علی جوہر کا مرثیہ ارمغانِ حجاز میں ضرور شامل کرنا چاہیے تھا جو ایک روزنامہ ہمدم کے صفحہ اول پر شایع ہوا اور ملک کے تمام اخبارات نے نقل کیا اور شاید کوئی دوسرا مرثیہ اس پائے کا نہیں، اس کے علاوہ اور بھی کئی چیزیں ہیں جو وقتی سیاست کے ساتھ تعلق رکھتی تھیں اور علامہ اقبالؒ ہی کے قلم سے نکلی ہیں۔ مثلاً حضرت علامہ نے علی برادران کی رہائی پر جو اشعار لکھے وہ مسلم لیگ کے اجلاس عام منعقدہ امرتسر میں پڑھ کر سُنائے لیکن بانگِ درا میں جبکہ ان کا ابتدائی دور تھا شایع کیے تو علی برادران کا ذکر نہ کیا۔ اسی طرح مہاتما گاندھی کی تعریف میں چھ اشعار لکھے جس میں انہیں مرد پختہ کار وحق اندیش و باصفا سے مخاطب کیا، وہ اشعار ۱۹۲۱ء کے زمیندار میں چھپ چکے ہیں۔

علامہ اقبال اپنی عمر کے آخری ایام میں قائد اعظم کے ساتھ تھے لیکن نومبر ۱۹۲۱ء کے زمیندار میں محمد علی جناح سے بھی پانچ شعروں میں چٹکی لی، اسی طرح پہلی جنگ عظیم علامہؒ نے دہلی کی وار کانفرنس میں نو بند کی ایک مسدس لکھ کر سُنائی جس میں شہنشاہ انگلستان سے متعلق دو بند قصیدے کا انتہائی غلو رکھتے ہیں۔ جب کہ یہ تمام نظمیں شاعرانہ محاسن کے باوجود علامہؒ نے اپنے کسی مجموعہ میں شامل نہیں کیں تو مولانا حسین احمد مدنی سے متعلق تین اشعار کا ارمغانِ حجاز میں شامل کیا جانا فی الواقع سیاسی بد مذاقی اور مذہبی حادثہ ہے اس میں یا یہ اشعار اور بھی افسوسناک معلوم ہوتے ہیں کہ علامہ اقبالؒ نے جس خبر سے متاثر ہو کر یہ اشعار لکھے تھے اس کی حقیقت سے آگاہ ہوتے ہی روزنامہ

"احسان" میں اس مطلب کا ایک خط چھپوایا کہ مجھ کو اس صراحت کے بعد کسی قسم کا کوئی حق ان پر اعتراض کرنے کا نہیں رہتا ہے[۱۳]

ارمغانِ حجاز میں مولانا مدنی سے متعلق اشعار کے شامل کیے جانے کو شورش کشمیری مرحوم نے ایک سیاسی بد مذاقی اور مذہبی حادثہ قرار دیا ہے، لیکن پروفیسر عمر حیات خاں غوری صاحب کا خیال ہے کہ ان اشعار کو ارمغان حجاز میں شامل رکھنا دیانت علمی کا تقاضا ہے، موصوف کا دعویٰ ہے کہ مولانا عبدالرشید طالوت (جن کی کوششوں سے اقبالؒ نے مولانا مدنی کے خلاف اپنا اعتراض واپس لے لیا) نے اقبال کو فریب دیکر ان اشعار کو کالعدم قرار دینے پر مجبور کیا۔ غوری صاحب کی دلیل یہ ہے کہ مولانا مدنی نے اپنے جس مکتوب میں اپنے نظریۂ قومیت کی وضاحت کی تھی اس مکتوب سے قابلِ اعتراض جملوں کو حذف کر کے اس کے اقتباسات اقبال کی خدمت میں مولانا طالوت نے ارسال کیے تھے۔ چنانچہ طالوت کے فریب میں مبتلا ہو کر اقبال نے اپنا اعتراض واپس لے لیا[۱۴]

یہ بات بالکل درست ہے کہ مولانا طالوت نے مولانا مدنی کے مکتوب کے اقتباسات اقبال کی خدمت میں ارسال کیے تھے لیکن اولاً مولانا طالوت نے اپنے خط بنام اقبال میں اس بات کی صراحت کر دی:

"یہ مولانا کی تقریر کے وہ اقتباسات ہیں جو میرے نزدیک ضروری تھے کہ آپ کی نگاہ سے گزر جائیں۔ جہاں تک میرا خیال ہے مولانا کی پوزیشن صاف ہے۔ آپ کی نظم کا اساس غلط پروپگنڈے پر ہے، اس لیے آپ کے نزدیک بھی اگر مولانا بے قصور ہوں تو مہربانی فرما کر اپنی عالی ظرفی کی بنا پر اخبارات میں ان کی پوزیشن صاف فرمایئے، بصورت دیگر مجھے اپنے خیالات سے مطلع فرمایئے تاکہ مولانا سے مزید تسلی حاصل کر لی جائے۔"[۱۵]

ثانیاً مولانا مدنی کے مکتوب مذکور کو مولانا طالوت نے بعینہ بغیر کسی حذف و ترمیم کے اخبار الانصاری میں شایع کرا دیا، ثالثاً وہ مکمل مکتوب ڈاکٹر اقبالؒ کی نگاہ سے بھی گزر چکا جیسا کہ اقبالؒ نے

بذاتِ خود اس کا اعتراف کیا ہے:

"مولوی صاحب کے اس بیان میں جو اخبار انصاری میں شایع ہوا ہے مندرجہ ذیل الفاظ ہیں:

"لہذا ضروری ہے کہ تمام باشندگانِ ملک کو منظم کیا جائے اور ان کو ایک ہی رشتہ میں منسلک کرکے کامیابی کے میدان میں گامزن بنایا جائے، ہندوستان کے مختلف عناصر اور متفرق ملل کے لیے کوئی رشتۂ اتحاد بجز قومیت اور کوئی رشتہ نہیں، جس کی اساس محض یہی ہوسکتی ہے۔"

ان الفاظ سے تو میں یہی سمجھا کہ مولوی صاحب نے مسلمانان کو مشورہ دیا ہے، اسی بنا پر میں نے وہ مضمون لکھا جو "اخبار احسان" میں شایع ہوا ہے، لیکن بعد میں مولوی صاحب کا ایک خط طالوت صاحب کے نام آیا جس کی ایک نقل انہوں نے مجھ کو بھی ارسال کی ہے، اس خط میں مولانا ارشاد فرماتے ہیں:

"میرے محترم سر صاحب کا ارشاد ہے کہ اگر بیان واقع مقصود تھا تو اس میں کوئی کلام نہیں ہے اور اگر مشورہ مقصود ہے تو خلافِ دیانت ہے اس لیے میں خیال کرتا ہوں کہ پھر الفاظ پر غور کیا جائے اور اس کے ساتھ ساتھ تقریر کے لاحق و سباق پر نظر ڈالی جائے، میں یہ عرض کر رہا تھا کہ موجودہ زمانے میں قومیں اوطان سے بنتی ہیں۔ یہ اس زمانے کی جاری ہونے والی نظریت اور ذہنیت کی خبر ہے۔ یہاں یہ نہیں کہا گیا کہ ہم کو ایسا کرنا چاہیے۔ یہ خبر ہے انشا نہیں ہے۔ کسی ناقل نے مشورے کو ذکر بھی نہیں کیا پھر اس کو مشورہ قرار دینا کس قدر غلطی ہے۔"

خط کے مندرجہ بالا اقتباس سے صاف ظاہر ہے کہ مولانا اس بات سے صاف انکار کرتے ہیں کہ انہوں نے مسلمانانِ ہند کو جدید نظریۂ قومیت اختیار کرنے کا مشورہ دیا۔ لہذا میں اس بات کا

اعلان ضروری سمجھتا ہوں کہ مولانا کے اس اعتراف کے بعد کسی قسم کا کوئی حق اعتراض کرنے کا نہیں رہتا۔[۲۶]

قارئین غور فرمائیں، مولانا طالوت نے اپنے مکتوب بنام اقبالؒ میں مولانا مدنی کے مکتوب کے اقتباسات ارسال کیے جانے کی صراحت کردی پھر اس مکتوب کو انصاری اخبار میں شایع بھی کرا دیا اور وہ مکمل مکتوب اقبالؒ کی نگاہ سے بھی گزر چکا، اس کے بعد اقبالؒ نے اپنا تردیدی بیان شایع کیا اس لیے غوری صاحب کا یہ خیال درست نہیں کہ مولانا طالوت کے فریب میں آکر اقبالؒ نے اپنا تردیدی بیان شایع کردیا۔

شورش کشمیری مرحوم کے حوالہ سے سطور بالا میں یہ بات لکھی جاچکی ہے کہ "دربار کانفرنس" کے موقع پر شہنشاہِ برطانیہ کی منقبت میں ڈاکٹر اقبالؒ کے قصیدے کے دو آخری بند انتہائی غلو رکھتے ہیں، اسی طرح ایک نظم میں اقبالؒ نے گاندھی جی کو مردِ پختہ کار، حق اندیش و باصفا کہا تھا، اس لیے ڈاکٹر صدیقی کا یہ خیال بھی محلِ نظر ہے کہ اقبالؒ کسی کی تعریف میں قصیدہ نگاری نہیں کرتے اور تحسین میں زمین و آسمان کے قلابے نہیں ملاتے۔[۲۷]

حوالہ جات

۱؎ ڈاکٹر محمد یٰسین مظہر صدیقی ندوی "ملفوظات اقبال کی ادبی اہمیت" معارف ستمبر ۱۹۹۶ء ص ۲۱۱
۲؎ مولانا سید ابوالحسن علی ندوی "نقوشِ اقبال" ص ۴۰۔ ۴۱ ۳؎ پروفیسر کلیم اختر ایم اے "ڈاکٹر اقبال اور مولانا سید انور شاہ کشمیری" ماہنامہ الرشید، ساہیوال پاکستان کا مدنی و اقبال نمبر ص ۴۲۳
۴؎ ایضاً ص ۴۲۴ ۵؎ ڈاکٹر اقبال، مکاتیب اقبال بنام مولانا سید سلیمان ندویؒ، معارف جولائی ۱۹۵۴ء ص ۸ ۶؎ ایضاً معارف ستمبر ۱۹۵۴ء، ص ۲۱۲ ۷؎ ایضاً معارف جولائی ۱۹۵۴ء ص ۴، ۸؎ عظیم فیروز آبادی، علامہ اقبال کا مبلغ علم، معلم اردو (لکھنؤ) اگست ۱۹۸۶ء، ص ۴۱ ۹؎ ڈاکٹر

محمد یسین مظہر صدیقی ندوی، ملفوظات اقبال کی ادبی اہمیت، معارف اگست ۱۹۹۶ء ص ۱۰۸ [10] عظیم فیروز آبادی، "علامہ اقبال کا مبلغ علم" معلم اردو، اگست ۱۹۸۶ء، ص ۳۵، بحوالہ مظلوم اقبال، ص ۱۴۳ [11] رحیم بخش شاہین، "خواجہ عبدالحمید کی ڈائری میں ذکر اقبال" اوراق گم گشتہ، ص ۳۰۳ [12] ڈاکٹر محمد یسین مظہر صدیقی ندوی، "ملفوظات اقبال کی ادبی اہمیت" معارف ستمبر ۱۹۹۶ء، ص ۲۰۶ [13] ماہنامہ الرشید (ساہیوال' پاکستان) ص ۳۶۵، بحوالہ مکتوب مولانا سید حسین احمد مدنیؒ [15] مولانا سید سلیمان ندویؒ حیات شبلی ص ۶۱۵ [16] ایضاً ص ۶۲۳ [17] سید طفیل احمد "مسلمانوں کا روشن مستقبل" ص ۵۲۶ تا ۵۴۵ [18] مولانا سید حسین احمد مدنیؒ، نقشِ حیات، حصہ دوم، ص ۲۳۹ [19] مولانا شاہ معین الدین احمد ندوی، حیاتِ سلیمان، ص ۲۴۱ [20] مولانا حبیب الرحمٰن قاسمی "متحدہ قومیت ا[illegible]سلام کی نظر میں" ص ۱۵ [21] مولانا انظر شاہ مسعودی، نقشِ دوام، ص ۲۱۴ [22] پروفیسر عبدالمغنی، "مولانا ابوالکلام آزاد کا تصور قومیت" ایوان اردو (دہلی)، ص ۱۲۳ [23] آغا شورش کشمیریؒ مرحوم "مولانا حسین احمد مدنیؒ اور علامہ اقبال" ماہنامہ الرشید (ساہیوال، پاکستان) کا مدنی و اقبال نمبر ص ۲، ۳ [24] پروفیسر عمر حیات خاں غوری "معرکۂ وطنیت" ص ۱۲ تا ۳۱ [25] پروفیسر یوسف سلیم چشتی، مسئلۂ قومیت پر مولانا سید حسین احمد مدنیؒ اور علامہ اقبال مرحوم کے اختلاف رائے کی حقیقی نوعیت، ماہنامہ الرشید' مدنی و اقبال نمبر ص ۳، ۲ [26] ایضاً ص ۴، ۳، ۵، ۳ [27] ڈاکٹر محمد یسین مظہر صدیقی ندوی، ملفوظات اقبال کی ادبی اہمیت، معارف ستمبر ۱۹۹۶ء، ص ۲۱۴۔

مصر کے ممتاز ادیب۔ زکی مبارک

از

جناب صفدر سلطان اصلاحی، علی گڑھ

(۲)

بغداد کے "استوریا" ہوٹل میں ان کے اعزاز میں صحافیوں کی ادبی شاخ نے ایک عظیم الشان جلسہ منعقد کیا تھا۔ جس میں عراقی شعرا و ادبا کی ایک بڑی تعداد شریک تھی کہ

زکی مبارک نے عراق میں اپنے قیام کے دوران صرف بحث و تحقیق اور درس و تدریس ہی سے سروکار نہیں رکھا بلکہ ان کی توجہ ملک اور قوم کی اہم اور بنیادی ضروریات پر بھی مرکوز رہتی تھی جس کی تکمیل کی جانب وہ ارباب حل و عقد کو متوجہ کرتے۔ ایک یونیورسٹی کا قیام انکے نزدیک اہل عراق کی سب سے بڑی ضرورت تھی۔ اس ضرورت کو واضح کرنے کے لیے انہوں نے سیکڑوں صفحات لکھے۔ وہ اس یونیورسٹی کو جامعہ مصریہ کی طرح عصری تقاضوں کے مطابق نئی نسل کی تعلیم و تربیت کا مرکز بنانا چاہتے تھے۔ ان کے انتقال کے بعد ان کی یہ کوشش بارآور

---

[1] الہلال ۳ر ۱۹۶۳ء، ص ۱۲ [2] اعلام النثر والشعر فی العصر العربی الحدیث، محمد یوسف کوکن، ص ۱۴۳ [3] ایضاً ص ۱۴۳ [4] ایضاً ص ۱۴۳۔

ثابت ہوئی۔[1]

عراق میں زکی مبارک کا قیام کل دس ماہ رہا، اس زمانہ میں ان کی کتاب "عبقریۃ الشریف الرضی" خاص طور پر موضوع بحث رہی، ادبی حلقوں کی طرف سے اس کی تعریف بھی ہوئی اور تنقید بھی۔ یہ کتاب دراصل ان کے ان لکچرس کا مجموعہ تھی جو انہوں نے بغداد میں شعبۂ قانون کی دعوت پر دیے تھے' یہ اپنے موضوع کے لحاظ سے اہم اور مفید ثابت ہوئی[2]

عراق میں دس ماہ کے مختصر قیام کے بعد زکی مبارک مصر کی طرف اس امید کے ساتھ واپس آئے تھے کہ وہ یا تو جامعہ مصریہ کے کسی شعبہ کے سربراہ ہوں گے اور یا تو وہ وزارت میں کسی اعلی منصب پر فائز ہوں گے لیکن ارباب حل وعقد پہ مسلسل یلغار کی وجہ سے وہ اپنے مقصد میں کامیاب نہیں ہوئے۔ انہیں اس کا بہت افسوس تھا وہ اپنے سے کمتر افراد کو بلند مقام و مرتبہ پر فائز دیکھ کر حزن وملال کا اظہار کرتے تھے اور اپنی علمی صلاحیتوں کی ناقدری پر ماتم کرتے تھے۔ لیکن یہ سب کچھ غیر مفید ثابت ہوا[3]

زکی مبارک اپنے عنفوان شباب ہی سے "البلاغ" اور "الرسالۃ" میں لکھنے لگے تھے۔ عمر کے آخری زمانہ میں بھی یہ سلسلہ جاری رکھا۔ آخری ایام میں "الرسالۃ" کے مدیر احمد حسن زیات سے بعض مسائل میں اختلاف کی وجہ سے دونوں کے تعلقات اچھے نہیں رہے۔ اس کے بعد وہ صرف "البلاغ" ہی میں لکھتے تھے۔ لیکن ان پہ مایوسی کا ایسا غلبہ تھا کہ ۱۹۴۶ء سے ۱۹۵۱ء تک کی ان کی جو تحریریں البلاغ میں شایع ہوئیں وہ کمزور اور غیر موثر تھیں جن سے ان کے مضطرب اور پریشان حال دل کی ترجمانی ہوتی تھی[4]

---

۱ زکی مبارک، انور الجندی، ص ۱۴۲ ۲ عبقریۃ الشریف الرضی، زکی مبارک ص ۳ ۳ اعلام النثر والشعر فی العصر الحدیث: یوسف کوکن، ص ۱۴۲ ۴ ایضاً: ص ۱۴۳۔

محرومی اور مایوسی کے بڑھتے ہوئے احساس نے انہیں شراب نوشی کا عادی بنا دیا تھا اور یہ عادت روز بروز بڑھتی ہی گئی۔ یہاں تک کہ آخر میں وہ ہر وقت نشے میں چور رہتے تھے اور عجیب وغریب باتیں اپنے منھ سے نکالتے رہتے تھے۔ لوگوں کو اس پر بیحد تعجب ہوتا تھا[1]

آخری دنوں میں ان کا حال اور ابتر ہوگیا تھا۔ ادبی وشعری محفلوں میں شرکت کے لیے جاتے تو رہ رہ کر آوازیں نکالتے، گاتے اور ہنستے تھے[2] اس زمانے میں انہیں اپنی کتابوں، کپڑوں اور تصنیفات کا بھی ہوش نہیں رہتا تھا۔ ان کے کتب خانہ میں دیمک لگ گئی تھی بعض اخبارات نے لکھا ہے:

"زکی مبارک کی ذاتی لائبریری پانچ بڑے کمروں پر مشتمل ہے۔ ان میں بیس ہزار سے زیادہ کتابیں ہیں۔ بہت سی کتابوں میں دیمک لگ گئی ہے۔ کچھ کتابیں الماریوں میں رکھی ہوئی ہیں جبکہ بہت سی کتابیں کھڑکیوں، کرسیوں، بر جیوں اور زمین پر رکھی ہوئی ہیں۔ زکی مبارک اپنی لائبریری میں کسی کو داخل ہونے کی اجازت نہیں دیتے ہیں۔ اس لیے کتابوں پر گرد وغبار بڑھتی جارہی ہے۔ یہ سلسلہ گزشتہ دس سال سے جاری ہے۔ اگر کبھی ان کے ذہن میں کوئی بہترین خیال اور شعر آتا ہے تو کاغذ نہ ہونے کی وجہ سے وہ اسے کھڑکیوں، لکڑیوں اور دیواروں پر لکھ دیتے تھے۔ اکثر ان کا ٹیلیفون کتابوں اور کاپیوں کے درمیان غائب ہوجاتا ہے۔"[3]

آخری دنوں میں زکی مبارک توفیقیہ میدان کے سامنے ایک قہوہ خانے میں پورے دن اور آدھی رات گئے تک بیٹھے رہتے تھے۔ تمام ادبی، علمی اور سماجی کاموں سے کنارہ کشی اختیار کرکے صرف البلاغ میں اپنی بکھری ہوئی یادوں کو "الحدیث ذو شجون" کے نام سے ٹوٹے پھوٹے لفظوں اور انداز میں مرتب کر دیا کرتے تھے۔

---

۱ زکی مبارک، انور الجندی، ص ۱۷۸ ۲ ایضاً، ص ۱۸۳ ۳ ایضاً، ص ۱۸۳

۲۱ جنوری ۱۹۵۲ء کو زکی مبارک اپنے بعض رفقاء کے ہمراہ شارع عماد الدین میں چہل قدمی کر رہے تھے کہ اچانک بے ہوش ہوکر زمین پر گر پڑے۔ سر میں شدید چوٹ آگئی، کار کے ذریعہ گھر لائے گئے۔ دوسرے دن صبح ساڑھے پانچ بجے تک انہیں ہوش نہیں آیا۔ ڈاکٹروں نے فوری آپریشن کے لیے زور دیا۔ چنانچہ دمرداش اسپتال میں داخل کیے گئے۔ آپریشن ہوا لیکن وقت اجل آچکا تھا۔ چنانچہ ۲۳ جنوری ۱۹۵۲ء کو اپنے مالک حقیقی سے جاملے[1]۔

علمی و ادبی خدمات

زکی مبارک نے اپنی پوری زندگی علم و ادب کی خدمت کے لیے وقف کردی تھی۔ ان کی تحریریں ان کی قلبی کیفیات، احساسات اور جذبات کی ترجمان، تصنع و تکلف سے بری اور حقیقت و واقعیت سے بہت قریب ہوتی تھیں۔ مفہوم و مدعا کی وضاحت میں کسی طرح کا غموض وخفا اور تعقید و ابہام نہ پائے جانے کی وجہ سے پڑھنے والوں کے دلوں میں وہ بہت جلد جاگزیں ہوجاتی تھیں۔ احمد حسن زیات نے ان کو دس اہم ادبا میں شمار کیا ہے۔ وہ عربی ادب میں ایک نئے اسکول کے معمار تھے۔ ان کی سب سے بڑی خوبی یہ تھی کہ ان کا قلم ہمیشہ عربی زبان اور وطن کی خدمات کے لیے وقف رہا۔ انہوں نے اپنے دور کے بعض دوسرے ادیبوں کی طرح کبھی استعماری طاقتوں کی خدمت اور غلامی گوارا نہیں کی۔

زکی مبارک نے مختلف النوع موضوعات پر تقریباً تیس کتابیں یادگار چھوڑی ہیں، ان کی بعض اہم کتابوں کے نام یہ ہیں:۔

(۱) الاخلاق عند الغزالی (۲) التصوف الاسلامی فی الادب والاخلاق (۳) عبقریۃ الشریف الرضی (۴) المدائح النبویۃ فی الادب العربی (۵) الموازنۃ

۱؎ الاعلام الالف: انور الجندی، ص ۱۲۹، و اعلام النثر والشعر فی العصر العربی الحدیث: محمد یوسف کوکن ص ۱۳۴ و زکی مبارک، انور الجندی، ص ۱۸۴۔

بین الشعراء (۶) مدامع العشاق (۷) النثر الفنی فی القرن الرابع (۸) سرائر الروح الحزین (۹) اکواب الشهد والعلقم (۱۰) ذکریات باریس (۱۱) شرح الرسالۃ العذراء (۱۲) حب ابن ربیعۃ وشعرہ (۱۳) البدائع (۱۴) اصلاح اشنع خطا فی التشریع الاسلامی (۱۵) الفقہ والدین والتقالید فی حیاۃ الاستقلال (۱۶) وحی بغداد (۱۷) لیلی المریضۃ فی العراق (۱۸) کتاب الاسمار والاحادیث (۱۹) دیوان الحان الخلود (۲۰) ملامح المجتمع العراقی[1]۔

ان میں بعض کتابیں عربی ادب، بعض اسلامی فلسفہ، بعض عربی شاعری اور بعض ذاتی تاثرات و مشاہدات پر مشتمل ہیں۔ اس مختصر مقالہ میں ان سب پر مبسوط تبصرہ کی گنجائش نہیں ہے۔ اس لیے ذیل میں بعض اہم کتابوں کے تعارف پر اکتفا کیا جاتا ہے تاکہ مصنف کے فکر و اسلوب اور علمی و ادبی صلاحیت کا کسی حد تک اندازہ ہوجائے۔

الاخلاق عند الغزالی

پہلے گزر چکا ہے کہ یہ زکی مبارک کا پہلا تحقیقی مقالہ ہے۔ اس کے شروع میں ڈاکٹر منصور الفہمی کا ایک خط درج ہے جس میں انہوں نے مصنف کو ان کے خلاف معرکہ آرائی اور ہنگامے پر صبر و ضبط اور صفح جمیل سے کام لینے کی تاکید کی ہے۔ اپنے استاذ کی اس قابل قدر نصیحت کو انہوں نے بطور مقدمۂ کتاب شائع کیا۔

ڈاکٹر صاحب نے بتایا ہے کہ نقد و جرح کوئی نئی بات نہیں ہے۔ افکار کی تاریخ اس کی مثالوں سے بھری ہوئی ہے۔ انہوں نے قدماء کی تصنیفات میں غلطیوں کے امکانات بتاتے ہوئے نئی نسل کو ان پر از سر نو تحقیقی نظر ڈالنے اور حقائق کو واضح کرنے کی دعوت دی ہے[2]۔ فرماتے ہیں:

"تمہارے مقالے سے میں بہت خوش ہوا کیونکہ یہ پہلا مقالہ ہے، جس میں اسلامی افکار کی تاریخ

۱؎ فی الادب والحیاۃ، فاضل خلف ص ۱۰۵۔۱۰۷، ۲؎ مقدمہ علی الاخلاق عند الغزالی، زکی مبارک، ص ۴۔۵۔

و تنقید اور ان کا تجزیہ کیا گیا ہے۔ مجھے امید ہے کہ آئندہ لوگ اسی کے نقش قدم کا تتبع کریں گے۔[1]

"تمہارے مقالے کی وجہ سے ہنگامہ برپا ہوگیا، لیکن بخدا ہم ناراض نہیں ہیں۔ اس لیے کہ ہم حقیقت پسند ہیں اور ہم نے تمہیں اسی کا درس دیا ہے۔ خواہ کتنی ہی مشکلات کا سامنا ہو۔ اگر تم اپنے کو حق پر سمجھو تو اس پر پامردی سے قائم رہو اور نرمی و سنجیدگی سے اس کی مدافعت کرتے رہو، جس طرح تم پر حق کی حمایت اور اس کا دفاع لازم ہے اسی طرح غلطی واضح ہوجانے کے بعد تم پر رجوع کرلینا بھی لازم ہے، اس لیے کہ حق کی طرف رجوع بڑائی ہے اور باطل پر اصرار عیب ہے۔ حق کے بعد گمراہی ہی گمراہی ہے۔ فماذا بعد الحق الا الضلال"[2]

زکی مبارک کتاب کے آغاز میں حمد و ثنا کے بعد لکھتے ہیں :۔

"اس کتاب کو میں جمہور کے سامنے اس لیے پیش کر رہا ہوں کہ حق و صداقت کے طالبین اس کی طرف رجوع کرسکیں۔ اسی کتاب کی وجہ سے مجھ پر کفر و زندقہ کا الزام لگایا گیا ہے اور حاسدوں نے مجھ کو مطعون کیا ہے۔ میں بخدا اپنی کسی رائے پر شرمندہ نہیں ہوں۔ نہ میں حق کے معاملے میں لومۃ لائم کی پروا کرتا اور نہ حاسدین کی سازشوں اور خفیف العقل لوگوں کی لغویات کا کوئی وزن محسوس کرتا ہوں۔ مجھ کو اس بات پر البتہ افسوس ہے کہ اس کتاب کے دفاع میں میرے احباب پریشانیاں برداشت کر رہے ہیں"[3]

کتاب کے کل چودہ ابواب کے مشمولات اس طرح ہیں۔

پہلے باب میں امام غزالی کے زمانہ، اس کی خصوصیت، ان کے دور کے اہم فرقوں اور مشہور شہروں کا ذکر ہے۔ دوسرے باب میں امام غزالی کی پیدائش سے موت تک کے واقعات کی تفصیل ہے۔ تیسرے باب میں امام غزالی کے مآخذ و مراجع سے بحث کی گئی ہے۔ ان میں فلسفیانہ

[1] مقدمہ طبع "الاخلاق عند الغزالی، زکی مبارک"، ص ۷ [2] ایضاً ص ، [3] ایضاً ص ۸۔

و متصوفانہ کتابوں کے علاوہ مذہبی آسمانی کتابوں کا بھی ذکر ہے

چوتھے باب میں امام غزالی کی تصانیف، طریقۂ تصنیف، ان پر اعتراضات اور افتراپردازیوں پر نظر ڈالی گئی ہے۔ پانچویں سے دسویں باب تک اخلاقیات کے بارے میں امام غزالی کے افکار و خیالات کا جائزہ لیا گیا ہے۔ کتاب کے یہی باب زیادہ اہم اور معرکۃ الآرا ہیں اور ان کی وجہ سے مصنف پر تنقید کی گئی ہے۔ گیارہویں باب میں امام غزالی اور ان کی تصانیف کے اثرات، ان کے تلامذہ اور ان کی تجدیدی خدمات زیر بحث آئی ہیں۔

بارہویں باب میں امام غزالی کے موافقین و مخالفین کا ذکر ہے۔ جن میں حافظ ابن قیم، امام ابن تیمیہ، علامہ ابن رشد، علامہ سبکی اور زبیدی کا تذکرہ کیا گیا ہے۔

تیرہویں باب میں امام غزالی اور جدید فلاسفہ کے افکار پر گفتگو کی گئی ہے۔

چودہویں باب میں معاصر عرب علماء کے افکار و نظریات پر بحث کی گئی ہے۔

تیرہویں باب میں جن جدید فلاسفہ کے افکار کا جائزہ لیا گیا ہے ان میں ڈیکارٹ، ہوبس، یونلبر، کارایل، سپنیوزا اور مالبرانش وغیرہ کے نام خاص طور سے قابل ذکر ہیں اور چودہویں باب میں جن جدید عرب علماء کے افکار پر بحث کی گئی ہے ان میں منصور فہمی، علی عبد الرزاق، شیخ یوسف الدجوی، جاد المولیٰ بک، شیخ جاویش، عبد الوہاب عزام اور احمد امین وغیرہ قابل ذکر ہیں۔[1]

یہ کتاب ۷۹ صفحات پر مشتمل اور مطبعہ دار الکتاب العربی مصر سے شایع ہوئی۔

النثر الفنی فی القرن الرابع زکی مبارک کی تمام تصنیفات میں یہ تصنیف سب سے اہم اور ضخیم ہے۔ اس کے متعلق بھی پہلے بتایا جاچکا ہے کہ یہ اصلاً فرانسیسی زبان میں ان کی ڈاکٹریٹ کا مقالہ ہے۔ عربی زبان میں اس پر پہلا مقدمہ ۱۹۳۲ء میں لکھا گیا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ عربی میں

[1] تفصیل کے لیے زکی مبارک کی کتاب "الاخلاق عند الغزالی" مطبوعہ دار الکتاب العربی مصر کو دیکھا جاسکتا ہے۔

اس کی پہلی اشاعت ۱۹۳۴ء یا ۱۹۳۵ء میں ہوئی ہوگی۔

یہ کتاب مصنف کے بیس[۲] سالہ فرانسیسی اور عربی ادب کے مطالعہ کا نچوڑ ہے۔ اس کی تالیف کے دوران انہیں شدید مصائب وآلام کا سامنا کرنا پڑا۔ وہ سال کے نصف حصے میں قاہرہ رہتے تھے اور دوسرے نصف میں پیرس۔ قاہرہ میں قیام کا مقصود رزق کی فراہمی اور پیرس میں قیام کا مقصود علم وادب کا حصول تھا۔ پھر حصولِ علم وادب کے لیے انہیں پیرس میں مکمل یکسوئی حاصل کرنی پڑی[۱]

ذکی مبارک نے مقدمہ میں کتاب کی خصوصیات پر روشنی ڈالی ہے۔ وہ اسے عربی زبان میں اپنی نوعیت کی ایک منفرد کتاب بتاتے ہیں۔ اس کتاب نے عربی زبان میں فن نثر کے نشو ونما سے متعلق مستشرقین اور ان کے مشرقی مقلدین کے مزعومات کو بے بنیاد ثابت کرکے یہ واضح کردیا ہے کہ عربوں میں فنی نثر عہد بوت کے کئی سال پہلے سے موجود تھی۔ جس کی سب سے بڑی دلیل قرآن مجید ہے۔ اگر عرب نثر نگاری سے ناآشنا ہوتے تو قرآن مجید اس شکل میں نازل ہونے کے بجائے کسی اور شکل میں نازل ہوتا[۲]

اس کتاب میں دلائل سے ثابت کیا گیا ہے کہ عربی زبان کے اندر مسجع ومقفی عبارتوں اور پرتصنع وپرتکلف تحریروں کا مرجع یونانی اور فارسی ادب کے بجائے خود قدیم عربی ادب ہے۔ اسی طرح قصص، مقامات، حکایات اور داستانوں کے لکھنے والوں اور ان کے اوصاف وخصائص پر بھی اس کتاب میں مفید اور لائق مطالعہ مباحث ہیں[۳]

ذکی مبارک نے اپنی کتاب میں بعض ایسے اہم حقایق پیش کیے ہیں جن سے اہلِ علم وادب واقف نہیں تھے۔ چنانچہ وہ معری کے رسالہ الغفران کے بارے میں لکھتے ہیں:

[۱] مقدمہ "النثر الفنی" ذکی مبارک، ص ۵ [۲] ایضاً ص ۶ [۳] ایضاً ص ۶۔

"مشرق ومغرب کے ادبا اور اہل علم یہ سمجھتے تھے کہ "رسالۃ الغفران" تفریح اور دلچسپی کے مقصد سے عربی زبان میں لکھی گئی پہلی کتاب ہے۔ جس کی نقل ابن شہید نے رسالہ "التوابع والزوابع" میں کی ہے۔ میں نے پہلی بار یہ ثابت کیا کہ رسالہ التوابع والزوابع لابن شہید کی تصنیف رسالۃ الغفران للمعری کی تصنیف سے بیس سال قبل ہوئی تھی اور معری نے ابن شہید کی نقل کی ہے"[۱]

محبت کے موضوع پر ابن حزم کی ایک تصنیف کی نشاندہی پہلی بار اس کتاب میں کی گئی ہے۔ جس سے لوگ بے خبر تھے، اسی طرح اس میں ابن درید کو فن قصہ گوئی کا بانی قرار دیا گیا ہے۔

ذکی مبارک نے اپنی کتاب میں نثر نگاری کی اہمیت واضح کرتے ہوئے بتایا ہے کہ نثر عقل وفکر کی زبان ہے اور دورِ حاضر میں اس کی ضرورت ہے۔ شعر سے لوگوں کو اب کوئی خاص لگاؤ باقی نہیں رہ گیا ہے۔ یہ کتاب ان کی نظر میں نثر کو اس کا حقیقی درجہ دلانے اور چوتھی صدی ہجری کے نثری اسالیب کو واضح کرنے کی ایک کوشش ہے[۲]

اس کتاب کا سب سے نمایاں پہلو یہ ہے کہ اس میں مصنف نے بعض فرانسیسی اساتذہ پر سخت تنقید کی ہے۔ جبکہ اس زمانے میں مشرقی اہلِ علم وادب اپنے مغربی اساتذہ سے اتنے مرعوب ہوتے تھے کہ ان پر کسی قسم کی تنقید کی جرأت نہیں کرسکتے تھے۔ انہوں نے کتاب کی دو فصلوں میں مستشرقین کے خیالات کا تنقیدی جائزہ لیا ہے۔ اس میں خاص طور سے مسٹر مرسیہ اور ان کے مقلد ڈاکٹر طٰہٰ حسین کا ذکر ہے[۳]

مقدمہ میں مصنف نے کتاب پر عائد کردہ اعتراضات کا جائزہ لیتے ہوئے بعض کی صداقت کا اعتراف کیا ہے اور بعض کا مسکت جواب دیا ہے[۴]

[۱] مقدمہ "النثر الفنی" ذکی مبارک، ص ۷ [۲] ایضاً ص ۷ [۳] ایضاً ص ۱۲-۱۴ [۴] ایضاً ص ۷-۸۔

کتاب دو جلدوں اور چھ ابواب پر مشتمل ہے۔

پہلے باب میں جاہلی دور سے لے کر تیسری صدی ہجری تک کی نثر، اس کے ارتقا اور اس میں ہونے والے تغیرات اور تبدیلیوں پر بحث کی گئی ہے۔ دوسرے باب میں چوتھی صدی ہجری کی نثری خصوصیات پر روشنی ڈالی گئی ہے، تیسرے باب میں حکایات، قصص، اخبار اور روایات کی اہم کتابوں کا تعارف اور ان کی امتیازی حیثیت دکھائی گئی ہے۔ چوتھے باب میں انشا پرداز ادیبوں، تنقید نگاروں اور متکلمین کا تذکرہ ہے، جن میں ابوالحسن الجرجانی، ابن الفارس، ابن شہید، ابوبکر الباقلانی، ابوالقاسم الآمدی، ابوالہلال العسکری، ابوعلی الحاتمی اور عبداللہ المرزبانی شامل ہیں۔ پانچویں باب میں ابوحیان التوحیدی، ابوعلی بن مسکویہ، ابن نباتہ الخطیب، ابومحمد بن حزم اور ابومنصور بن الثعالبی پر بحث کی گئی ہے۔ چھٹے باب میں ابوالفضل بن العمید، ابوحفص بن برد، ابوالمغیرہ بن حزم، ابوالفرج الببغا، صاحب بن العباد، ابوبکر الخوارزمی، قابوس بن وشمگیر، ابواسحاق الصابی، ابن شہید اور بدیع الزماں وغیرہ کے رسائل پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ یہ کتاب دارالجیل بیروت سے ۱۹۷۵ء میں شائع ہوئی۔

التصوف الاسلامی فی الادب والاخلاق یہ کتاب بھی زکی مبارک کا تحقیقی مقالہ ہے۔ اس پر انکو ۱۹۳۷ء میں جامعہ مصریہ سے ڈاکٹریٹ کی ڈگری دی گئی۔ اس ضخیم کتاب میں ادب اور اخلاق پر اسلامی تصوف کے اثرات کا جائزہ لیا گیا ہے۔

کتاب کی ابتدا میں استاد محمد جاد المولی بک کا مقدمہ ہے۔ وہ "الاخلاق عند الغزالی" اور "التصوف الاسلامی" دونوں مقالوں کے مناقشہ و مباحثہ میں شریک تھے۔ ان کا تاثر ملاحظہ ہو:

"اس کتاب کے تمام مندرجات سے اتفاق کرنا میرے لیے ممکن نہیں ہے۔ اس میں کوئی حرج بھی نہیں ہے۔ کیونکہ محققین بالعموم کسی رائے پر متفق نہیں ہوتے، اصل چیز محقق کی نیت کی صفائی اور آزادیٔ فکر ہے، زکی مبارک نے تصوف کے رموز و افکار سے واقف شخص کی طرح تصوف کا مطالعہ کیا ہے"[1]

• فلسفیانہ انداز کتاب میں پوری طرح نمایاں ہے۔ مصنف جب کسی رائے کو پیش کرتے ہیں تو سب سے پہلے اسکے مختلف پہلوؤں پر بحث کرتے ہیں، پھر اسے تجزیاتی انداز میں پیش کرتے ہیں"[2]

• ان کی خوبی یہ ہے کہ انہوں نے نہ تصوف کی طرف دعوت دی ہے اور نہ ہی اس پر حملہ کیا ہے۔ البتہ اس میں تصوف پر تنقید کی ہے اور اس کے محاسن و عیوب دونوں واضح کیے ہیں اور بڑی جرأت، صراحت اور صفائی سے اس کے ضعف و قوت کو نمایاں کیا ہے"[3]

• کتاب کے آغاز میں اس محنت و صعوبت کا ذکر ہے جو مصنف کو اس کی تالیف میں اٹھانی پڑی"[4]

یہ کتاب جیسا کہ نام ہی سے ظاہر ہے بہت زیادہ مشکل اور پر پیچ تھی، اسی لیے جب مقالہ کے موضوع کا تذکرہ زکی مبارک نے اپنے اساتذہ کے سامنے کیا تو انہوں نے اس کی مشکلات کا اندازہ کر کے اسے موضوعِ تحقیق بنانے سے منع کیا مگر زکی مبارک نے اس کا جواب یہ دیا تھا:

"میں اس امر کی وضاحت کرنا چاہتا ہوں کہ تصوف نے کس طرح ادب و اخلاق میں ایک مستقل مذہب کی شکل اختیار کر لی ہے، ظاہر ہے اس کا یہ پہلو لائقِ مطالعہ و تحقیق ہے"[5]

اس کتاب کے کل دو حصے ہیں:

(۱) التصوف فی الادب　　(۲) التصوف فی الاخلاق

---

[1] مقدمہ التصوف الاسلامی، زکی مبارک، ص، [2] ایضاً [3] ایضاً [4] فاتحۃ الکتاب، زکی مبارک ص۹ [5] التصوف الاسلامی زکی مبارک ص ۱۶۔

پہلا حصہ ۳۹۸ صفحات پر اور دوسرا حصہ ۳۴۱ صفحات پر مشتمل ہے۔[1] ۴ اپریل ۱۹۳۶ء
کو اس کتاب پر کھل کر بحث ہوئی، کمیٹی نے بعض چیزوں کے حذف و اضافہ کا مشورہ دیا، چنانچہ
مصنف نے کتاب پر نظر ثانی کے وقت بعض فصلوں اور حاشیوں کا اضافہ کیا اور بعض گنجلک
مقامات کی توضیح کی۔ جب مصنف کو عراق جانے کا موقع ملا تو وہاں انہیں تصوف اور تشیع
کے اتصال کا پتہ چلا جس کے بعد انہوں نے کتاب کو نئی شکل دے دی۔[2]

جلد اول میں پہلے مصنف نے تصوف کا حقیقی مفہوم، تصوف کی مختلف شکلیں اور
ادب و اخلاق میں تصوف کے اثرات پر گفتگو کی ہے۔ پھر کتاب کے اغراض و مقاصد، لفظ
تصوف کی لغوی و اصطلاحی تحقیق، ادب میں تصوف کے اثرات، شعراء کا زہدیہ کلام، صوفی
ادب کے متروک ذخیرے، دنیا کی مذمت میں ادبی تمثیلات، ابن عطاء اللہ الاسکندری کی حکیمانہ
باتیں، محی الدین العربی کا ادب و تصوف میں مقام، حسین بن منصور الحلاج کی شکست، عاصی
و مطیع کا صحیح مقام، ابن عربی، یافعی اور دوسرے صوفیہ کی منظومات، نابلسی کے اشعار، حسن
رضوان کی منظومات، نبوی مدائح، حب الٰہی کی وارفتگی، ابن فارض، کتب تصوف میں اسلامی
سوسائٹی کی تصویر، عربی لہجات اور فنون جمیلہ میں تصوف کے اثرات وغیرہ پر الگ الگ
فصلوں اور ابواب میں محققانہ گفتگو کی گئی ہے۔

دوسری جلد میں اخلاق میں تصوف کے نشو و نما کے طریقوں، دعائیں و اوراد،
وصیتیں و نصیحتیں، احوال و مقامات، تجرید، کھانے کے آداب، روزے کے آداب، شادی
کے آداب، بھائی چارگی کے آداب، محبت، موسیقی، غنا اور ہلاکت خیز و نجات دہندہ
اعمال پر گفتگو کی ہے۔ دونوں جلدوں کے آخیر میں ان کے مباحث کا خلاصہ بھی ہے اور

[1] التصوف الاسلامی، زکی مبارک، ص ۱۱ [2] ایضاً

پھر قوافی و اعلام کی تفصیلی فہرست ہے۔[1]

المدائح النبویۃ فی الادب العربی رسول کریم کی شان اقدس میں ابتدائے اسلام ہی سے شعراء
اپنا منظوم نذرانۂ عقیدت پیش کرتے رہے ہیں۔ دنیا کی کوئی زبان نعتیہ قصائد سے خالی نہیں ہے۔
عربی زبان میں بھی مدح و منقبت کے قصائد کا رواج ابتدائے اسلام ہی سے عام ہو گیا تھا۔
حضرت حسان بن ثابت، کعب بن زہیر اور عبداللہ بن رواحہ عہد نبوی کے ممتاز اسلامی شعراء
تھے۔ اس کے بعد بھی یہ سلسلہ جاری رہا اور آج تک جاری ہے لیکن اس رواج عام کے باوجود
نعتیہ قصائد کی خصوصیات، فنی خوبیوں اور کمزوریوں پر باقاعدہ کام نہیں ہوا تھا۔ غالباً زکی مبارک
نے پہلی بار اس ضرورت کو محسوس کر کے اس پر قلم اٹھایا اور کسی حد تک اس کا حق ادا کرنے کی
کوشش کی۔[2]

گو یہ کوئی مستقل تصنیف نہیں ہے۔ بلکہ مصنف کی کتاب "اثر التصوف الاسلامی
فی الادب والاخلاق" کا ایک باب ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

"یہ کتاب کوئی مستقل کتاب نہیں ہے یہ "اثر التصوف فی الادب والاخلاق" ہی کا ایک
باب ہے۔ اسے جامعہ مصریہ میں ڈاکٹر منصور فہمی، استاذ مصطفیٰ عبدالرزاق اور ڈاکٹر عبدالوہاب
العزام پر مشتمل ایک کمیٹی کے سامنے بغرض بحث و تبصرہ پیش کیا گیا تو اس کمیٹی نے مشورہ دیا کہ
مدائح نبویہ کا باب کتابی شکل میں شایع کیا جائے، میں نے اس تجویز کو مناسب سمجھا اس طرح
عربی زبان میں اس فن پر ایک مخصوص کتاب لوگوں کے سامنے آگئی ہے"[3]

کتاب کے مقدمہ میں زکی مبارک نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی آپ کے نمایاں

[1] التصوف الاسلامی الجزء الاول والثانی، دار الکتاب العربی، مصر ۱۹۷۳ء [2] فاتحۃ الکتاب
"المدائح النبویۃ"، زکی مبارک، ص ۸ [3] ایضاً ص ۸۔

اوصاف، اخلاقی کمالات اور اس فن کی خوبیوں پر بحث کی ہے۔ وہ آپؐ کی حیاتِ طیبہ کو قرآن مجید کا آئینہ قرار دیتے ہوئے اس کے اعجاز کے مختلف پہلوؤں کو نمایاں کرتے ہیں اور ان ادیبوں پر اظہارِ افسوس کرتے ہیں جو اس عظیم کتاب کو چھوڑ کر بعض بد اخلاق شعراء کے کلام کو عربی زبان و ادب کا سب سے اچھا اور فصیح و بلیغ کلام قرار دیتے ہیں۔[۱]

اس کتاب میں سب سے پہلے یہ دکھایا گیا ہے کہ مدائحِ نبویہ کا اسلوب اور طرز ابتداء میں وہی تھا جو زمانۂ جاہلیت کے مدحیہ قصائد کا تھا۔ چنانچہ اعشیٰ کے دالیہ قصیدہ، کعب کے لامیہ اور حسان بن ثابت کے بعض منتخب قصائد پر بحث کرکے اپنی اس بات کو مدلل کیا ہے۔ پھر حضرت علیؓ کے خطبات کے مدحیہ عناصر و خصوصیات پر بحث کی گئی ہے۔[۲] پھر اہل بیت میں اسکے رواج اور اسلامی ملکوں میں اس فن کے ارتقا پر بحث کی ہے۔ اس سلسلے میں مختلف شعراء کے بارے میں اپنے مطال[...]عہ پیش کیا ہے، مثلاً کمیت کا جو اچھا شاعر تھا مفصل ذکر ہے اور دعبل پر بھی ایک فصل ہے جو ایک خبیث اللسان شاعر تھا۔ لیکن اس نے ایک ایسا قصیدہ یادگار چھوڑا ہے جس کی مثال بہت کم ملے گی۔ اس کے بعد کربلا کے بارے میں شریف رضی کے قصائد اور اہل بیت کے بارے میں مہیار کے قصائد کا مطالعہ پیش کیا گیا ہے۔ پھر بوصیری کے قصیدۂ بردہ پر دو فصلوں میں بڑی مفید گفتگو کی گئی ہے۔ اس کے بعد مدحِ نبوی کے فن ادب کا جز ہوجانے کی وجہ لکھی ہے اور اس کو فن بدیعیات کہا ہے جس کے ماہرین میں ابن حجۃ الحموی ایک بہت مشہور شخص گزرا ہے۔ اس نے آٹھویں صدی ہجری میں مصر اور شام کے ادب میں ایک ہلچل پیدا کردی تھی۔ آخیر میں ابن نباتہ مصری کے اشعار اور ان میں مدحِ نبوی کے عنصر پر بحث ہے۔ پھر مولدِ نبیؐ کے واقعہ پر اس کتاب کا خاتمہ ہوا ہے۔[۳]

---

[۱] فاتحۃ الکتاب "المدائح النبویۃ" زکی مبارک، ص ۹-۱۴ [۲] ایضاً ص ۱۴ [۳] ایضاً ص ۱۴-۱۵۔

مستقل تصنیف نہ ہونے کی بنا پر اس کتاب میں بڑے اختصار سے کام لیا گیا ہے۔ اسی لیے منتخب اور اہم شعراء کا کلام ہی زیرِ بحث آیا ہے۔ اگر اس فن کے تمام شعراء اور انشاپردازوں کا ذکر ہوتا تو گو کتاب بہت ضخیم ہوجاتی تاہم اس سے اس کی اہمیت بڑھ جاتی۔ لیکن اختصار کے باوجود یہ عربی زبان و ادب میں ایک گرانقدر اضافہ اور مصنف لائقِ ستائش ہے![۱]

عبقریۃ الشریف الرضی یہ کتاب عراق میں زکی مبارک کے زمانۂ قیام کی یادگار ہے۔ جو اصلاً ان کے ان لکچروں کا مجموعہ ہے جو فیکلٹی آف لا کے وسیع و عریض ہال میں دیے گئے تھے اور جس میں شرکا کی تعداد توقع سے زیادہ تھی۔ یہ علمی و ادبی لکچرس کافی محنت اور جانفشانی سے تیار کیے گیے تھے۔ مگر عراق کے ادبی حلقوں میں ان کی وجہ سے کھلبلی مچ گئی۔

شریف رضی زکی مبارک کی پسندیدہ شخصیت تھے۔[۲] عباس محمود عقاد اور طٰہٰ حسین نے ان سے اس پر لکھنے کی بہت پہلے فرمائش کی تھی۔ لیکن اس وقت تو انہیں اس کا موقع نہیں مل سکا مگر ۱۹۳۲ء میں جب ان کو "نادی الموظفین بالقاہرۃ" کی طرف سے کسی اہم شاعر کی حیات یا کلام پر لکچر دینے کی دعوت ملی تو انہوں نے شریف رضی ہی کو منتخب کیا۔ استاذ انیس المقدسی کی کتاب "امراء الشعر فی العصر العباسی" کا مطالعہ کرنے کے بعد انہوں نے اپنے ارادے کو عملی جامہ پہنانے کا مصمم عزم کرلیا، کیونکہ اس کتاب میں شریف رضی کا سرے سے کوئی تذکرہ ہی نہیں تھا۔[۳]

مصنف نے اپنی کتاب میں شریف رضی کو عربی زبان کا سب سے بڑا شاعر قرار دیا ہے۔ جس پر دوسرے اہلِ علم و ادب کی طرف سے اعتراض کیا گیا۔ زکی مبارک نے کتاب کے مقدمہ میں

---

[۱] اس کے کل صفحات ۲۱۸ ہیں [۲] فی الادب والحیاۃ، فاضل خلف، ص ۱۰۵ [۳] فاتحۃ الکتاب "عبقریۃ الشریف الرضی" ص ۳-۴

ان اعتراضات کا مفصل جائزہ لیا ہے[1] وہ رقم طراز ہیں:-

"میرے اور شریف رضی کے درمیان بڑی مشابہت ہے اگر وہ دوبارہ زندہ ہو جائیں تو مجھے بھائی کی طرح مجھ سے معانقہ کریں گے۔ میری طرح انہوں نے بھی زندگی بھر مصائب جھیلے جس طرح وہ حصول مجد و شرف کے لیے ساعی رہے، مگر زمانے نے ان کو بھلا دیا، اسی طرح میں نے بھی جد و جہد کی اور مجھے بھی بھلا دیا گیا:

شریف رضی کے ساتھ میرا یہ معاملہ خالص علمی بنیادوں پر مبنی ہے۔ میرا خیال ہے کہ بحث و تحقیق کا حق اسی وقت ادا ہو سکتا ہے، جب میں اس شاعر کے ساتھ ساتھ چلوں جس کی خصوصیات پیش کرنا چاہتا ہوں۔ میں اپنے کو اس وصف میں منفرد سمجھتا ہوں۔ . . . اس کتاب میں شواہد بہت زیادہ ہیں۔ یہی میری بحث کا طریقہ ہے۔ میں قاری کو اپنی ذات کے بجائے اس شخصیت میں معروف رکھنا چاہتا ہوں، جس کا تعارف میرے پیش نظر ہوتا ہے[2]

کتاب کے مقدمہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان لکچروں کو عراق اور دوسرے عرب ممالک میں پسندیدگی کی نظر سے نہیں دیکھا گیا، چنانچہ سرزمین عراق کے بعض ادیبوں کے اس معاندانہ رویے پر زکی مبارک نے سخت تعجب کا اظہار کیا ہے۔

یہ کتاب مطبعۃ الجریرہ اور مطبعۃ المعارف بغداد سے ۱۹۳۹ء میں شایع ہوئی۔ اس کے کل دو اجزا ہیں۔ پہلے جز میں شریف رضی کی عبقریت، شاعری، شعراء کے درمیان ان کے مقام و مرتبہ، زندگی کے فقر و فاقہ کے ایام اور عباسی خلفاء، امراء و سلاطین سے انکے تعلقات پر بحث کی گئی ہے۔ جبکہ دوسری جلد میں انکے دوست و دشمن، تعلقات و معاملات اور شاعری کی اقسام و خصوصیات پر بحث کی گئی ہے۔ دونوں اجزاء کے آخیر میں قوافی اور اعلام کی فہرست بھی ہے[3]

---

[1] فاتحہ کتاب "عبقریۃ الشریف الرضی" زکی مبارک، ص ۵ [2] ایضاً ص ۷-۸ [3] پہلی جلد ۲۵۶ صفحات پر اور دوسری جلد ۲۵۰ صفحات پر مشتمل ہے۔

معارف کی ڈاک

۵ رمضان المبارک ۱۴۱۸ھ

مکرمی و محترمی! السلام علیکم

دسمبر ۱۹۹۷ء کے معارف میں آپ کے شذرات کا ابتدائی حصہ پڑھ کر تشویش ہوئی تھی کہ کہیں آپ بھی تو نہیں "سنجیدہ، ذی شعور اور سمجھ بوجھ رکھنے والے" مسلمانوں میں شامل نہیں ہو گئے ہیں جو "ناسازگار حالات دیکھ کر . . . کہہ رہے ہیں کہ ایک بابری مسجد کے لیے آخر مسلمان کیوں اپنے کو ہلاک و برباد کر رہے ہیں۔ اسے بھول جائیں اور اس پر صبر کر لیں۔ . . . مسجد کا خیال چھوڑ دیں، اپنی تعمیر و ترقی کے سامان کریں اور اقتصادی و تعلیمی پسماندگی دور کرنے میں لگ جائیں"۔ لیکن جب شذرات کا باقی حصہ پڑھا تو طبیعت خوش ہو گئی۔

آپ نے حسب معمول بالکل صحیح موقف اختیار کیا ہے۔ جزاک اللہ۔ آپ نے سچ لکھا ہے کہ آخر مسلمان ایسی کیا بات کہہ رہے ہیں جس سے ملک کا امن و امان خطرے میں پڑ رہا ہے، یا جس سے خود ان کی تعمیر و ترقی میں خلل واقع ہو رہا ہے۔ لیکن وہ اس المیے کو جو ۶ دسمبر ۱۹۹۲ء کو اجودھیا میں پیش آیا اپنے دل سے کیسے نکال سکتے ہیں۔ یہ زخم تو اسی وقت بھرے گا جب اس کا مداوا ہو جائے گا۔ اس کا مداوا آج کے حالات میں جتنا بھی دشوار نظر آ رہا ہو لیکن مشیت الٰہی میں ماہ و سال کی کوئی حیثیت نہیں ہے اور اس کی قدرت ہر چیز پر حاوی ہے،

یہاں الہلال کلکتہ کا وہ اقتباس نقل کرنا بے موقع نہیں ہوگا جو مسجد کانپور کے غسل خانے کے انہدام کے تناظر میں اس میں ۱۱ر جون ۱۹۱۳ء کو شایع ہوا تھا۔ وھو ھذا:

"مسجدوں کی جب کبھی بحث چھڑتی ہے تو صرف چند عمارتوں کا سوال نہیں ہوتا بلکہ "قومی عزت و ذلت اور دینی تذلیل و تعظیم" کی ایک نظیر اگر آج قائم ہوتی ہے تو کل کے لیے اس کے دامن میں ہزاروں واقعات پنہاں ہوتے ہیں۔"

چنانچہ اس حادثہ فاجعہ کے دامن میں بھی نہ جانے کتنے واقعات پنہاں ہیں۔ حال ہی میں وشو ہندو پریشد کے سکریٹری شری اشوک سنگھل کا بیان آیا ہے کہ اگر مسلمان بنارس اور متھرا کی مسجدوں سے بھی بخوشی دست بردار نہ ہوگئے تو انہیں اسی تذلیل (HUMI-LIATION) کا سامنا کرنا پڑے گا جس کا اجودھیا میں کرنا پڑا تھا۔ ایک طرف یہ حوصلے اور یہ تیور ہیں اور دوسری طرف یہ مشورہ دیا جا رہا ہے کہ جو کچھ اجودھیا میں ہوا اسے فراموش کرکے اپنی تعمیر و ترقی کا سر و سامان کرو۔ جو لوگ ہماری تذلیل پر آمادہ ہیں وہ ہمیں اپنی تعمیر و ترقی بھی کہاں کرنے دیں گے۔ ایک ایسی مجلس میں جس میں ہندو مسلمان سب موجود تھے ایک دلت دوست نے کہا تھا کہ مجھے حیرت ہے کہ مسلمانوں میں اتنے عظیم حادثے کا وہ ردعمل کیوں نہیں ہوا جو ہونا چاہیے تھا۔ یہ ہے مسلمانوں کا مثالی صبر و سکون۔ اگرچہ اس کے جو عوامل ہیں اِن کا ذکر یہاں غیر ضروری ہے۔

بے شک متحدہ محاذ کی حکومت بھی اس معاملے میں مسلمانوں کی اشک شوئی کسی درجے میں نہیں کر سکی، لیکن اسے وقت ہی کتنا ملا اور جتنا ملا اس میں وہ کن پریشانیوں میں مبتلا رہی۔ اب بعض وہ لوگ جو بالواسطہ بابری مسجد کی شہادت کے ذمہ دار ہیں، کہہ رہے ہیں کہ کانگریس کو ہم دو مرتبہ تو سزا دے چکے اور کتنی سزا دیں گے۔ سوال سزا دینے کا نہیں ہے مسلمانوں کا مطالبہ بس

اتنا ہے کہ اس سلسلے میں عدالت میں جو مقدمات پیش ہیں جو حکومت بھی برسر اقتدار آئے انہیں جلد از جلد طے کرا دے اور عدالت کا جو بھی فیصلہ ہو اس پر عمل درآمد کرانے کی یقین دہانی کرائے۔ اب لوک سبھا کے جدید انتخابات آیندہ ماہ ہونے والے ہیں مسلمان کسی بھی سیاسی جماعت کے سیکولرزم اور حُسنِ نیت کی کسوٹی اس یقین دہانی کو بنالیں اور پھر ان انتخابات میں اسی کا ساتھ دیں۔

آپ کے شذرات کا دوسرا حصہ بھی جو اتر پردیش میں اردو کشی کی مہم سے متعلق ہے، توجہ طلب ہے لیکن اس پر گفتگو اس لیے نہیں کر رہا ہوں کہ خط بہت طویل ہو جائے گا۔

توقع تھی کہ مسلم یونیورسٹی کورٹ کی میٹنگ کے موقع پر آپ سے ملاقات ہوگی لیکن آپ نے ملاحظہ فرمایا کہ کورٹ کی میٹنگ دو مرتبہ کس قدر ناقابلِ یقین اور غیر منطقی بنیادوں پر ملتوی کر دی گئی۔ اب تو وائس چانسلر کا انتخاب یونیورسٹی کے اقلیتی کردار کے تحت ہو رہا ہے۔ پھر یہ سب کیا ہو رہا ہے؟

امید ہے مزاجِ گرامی بخیریت ہوگا۔ نیاز مند: ریاض الرحمٰن شروانی

(۲)

۵ر۲ر۱۹۹۸ء

مکرمی و محترمی! السلام علیکم و رحمۃ اللہ

میرا پچھلا نیاز نامہ مل گیا ہوگا۔ جنوری ۱۹۹۸ء کا معارف پرسوں موصول ہوا ہے۔ اس شمارے میں بھی آپ کا اداریہ بہت خوب ہے۔ اب بھارتیہ جنتا پارٹی کا انتخابی منشور بھی شایع ہو گیا ہے۔ اس میں بابری مسجد کی جگہ پر ایک "شاندار" رام مندر بنانے کے عزم کا اظہار کیا گیا ہے متھرا اور کاشی کے مسئلے پر خاموشی اختیار کی گئی ہے۔ ہندوستان کے آئین میں تبدیلی کرکے اسے سوامی وویکانند کے "روحانی" "نیشنلزم" مہاتما گاندھی کے رام راجیہ (اسے نظر انداز کر دیجیے کہ اس اصطلاح سے گاندھی جی کی کیا مراد تھی اور بی۔ جے۔ پی کے نیتاؤں کی کیا مراد ہے) اور بنکم چندر چٹرجی

کے وندے ماترم کے مطابق ڈھالنے کا قصد ظاہر کیا گیا ہے، آئین کی دفعہ ۳۰ میں ترمیم کرکے اقلیتوں کے تعلیمی اداروں میں دخل اندازی کا منصوبہ پیش کیا گیا ہے، جموں وکشمیر کی خصوصی پوزیشن کو ختم کرنا اور جملہ مذاہب کے "اچھے اچھے اصولوں" کو یکجا کرکے مشترک سول کوڈ بنانا تو ان کے پیشِ نظر رہے ہی۔ اب وہ لیپا پوتی بھی ختم ہوگئی ہے جو مسلمانوں کو رجھانے کے لیے اب تک کی جارہی تھی۔ دراصل بی۔جے۔پی کے نیتا جانتے ہیں کہ ان کا حقیقی ووٹ بینک کون سا ہے۔ اس لیے وہ مسلمانوں کے چند خود غرض عناصر کی خاطر اس ووٹ بینک کو کیسے ہاتھ سے جانے دے سکتے ہیں۔ اس کے باوجود جو مسلمان اپنے ذاتی اغراض کے تحت ان کی ہم نوائی کر رہے ہیں، ان کے بارے میں یہی کہا جاسکتا ہے کہ:

میر کے دین و مذہب کو اب پوچھتے کیا ہو، ان نے تو
قشقہ کھینچا، دیر میں بیٹھا، کب کا ترکِ اسلام کیا

آپ نے بالکل صحیح لکھا ہے کہ مسلمانوں کو اپنا عقیدہ، ثقافت اور معاشرت سب سے زیادہ عزیز ہیں اور یہی بی۔جے۔پی کے سب سے بڑے ہدف ہیں۔ فرقہ وارانہ فسادات کا مقابلہ تو مسلمان گزشتہ نصف صدی سے کرتے چلے آرہے ہیں اور انہیں صرف حافظِ حقیقی کی حفاظت پر بھروسہ ہے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ بی۔جے۔پی کی حکومت بن جانے کی صورت میں ان کی شدت میں کمی آجائے کیونکہ ان فسادات سے اس کا جو اصلی مقصد ہے وہ تو حاصل ہو ہی جائے گا۔

میرا سوچنے کا ڈھنگ اس معاملے میں فکرِ عام سے کسی قدر مختلف ہے۔ میرے نزدیک یہ گھڑی تنہا مسلمانوں سے کہیں زیادہ ہندوستان کے جملہ عوام (جن میں بھاری اکثریت ہندوؤں کی ہے) کے امتحان کی گھڑی ہے، کیونکہ بی۔جے۔پی کے برسرِ اقتدار

آنے سے تنہا مسلمانوں کو نہیں، پورے ملک کو خطرۂ عظیم پیش آئے گا۔ انہدامِ بابری مسجد کے سب سے بڑے سورما کلیان سنگھ جی نے کہا ہے کہ مسئلہ صرف اقتدار کی تبدیلی کا نہیں ہے، ایک جُگ کی تبدیلی کا ہے، یعنی مسئلہ یہ ہے کہ ہندوستان کو اکیسویں صدی میں جانا ہے یا اٹھارویں صدی میں واپس۔ اب یہ ہمارے عوام کو طے کرنا ہے کہ وہ ملک کو آگے لے جانا چاہتے ہیں یا پیچھے۔ آج سے پچاس سال قبل ملک کی تقسیم کے باوجود ہمارے قومی رہنماؤں نے نئی مملکت کو سیکولر آئین دیا تھا، کیونکہ ان کی نظر بہت دور تک دیکھ رہی تھی اور ہندوستان کے عوام نے ان کے اس اقدام کی تائید بعد میں آنے والے انتخابات میں انہیں بھاری اکثریت سے کامیاب بنا کر کی تھی۔ اب دیکھنا ہے کہ اس پچاس برس کی مدت میں ان کے طرزِ فکر میں کس حد تک مثبت اور کس حد تک منفی تبدیلی ہوئی ہے۔ یہ ضرور ہے کہ ہماری قومی لیڈرشپ میں اس دوران ہر اعتبار سے شدید انحطاط رونما ہوا ہے اور جیسا کہ آپ واقف ہیں الناس علیٰ دین ملوکہم کے مصداق اوپر کی سوچ نیچے تک سرایت کرتی ہے۔ دوسری طرف یہ بھی کہا جاتا ہے کہ کسی ملک کے عوام جس حکومت کے مستحق ہوتے ہیں انہیں وہی حکومت ملتی ہے۔

بہرحال اب فیصلے کی گھڑی سر پہ ہے۔ دیکھنا ہے کہ اس امتحان میں ہمارے عوام کتنے کھرے یا کھوٹے ثابت ہوتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ وہ کرے جس میں ملک اور ملت دونوں کا فائدہ ہو۔

امید ہے آپ بخیریت ہوں گے۔

نیازمند

ریاض الرحمٰن شروانی

وفیات

آہ! مولانا عثمان احمد قاسمی چل بسے

۴؍ رمضان المبارک ۱۴۱۸ھ کو راقم الحروف کے ایک کرم فرما اور دار المصنفین کے ہمدرد مولانا عثمان احمد قاسمی اللہ کو پیارے ہوگئے، اس کی اطلاع موصوف کے حقیقی بھانجے ڈاکٹر محمد اسامہ کے ایک خط سے ہوئی جو انتقال کے دو ہفتے بعد ملا، یہ خبر سخت تکلیف دہ تھی اور جنازہ کی شرکت سے محرومی کا تو ہمیشہ ملال رہے گا۔

شاہ گنج اور جونپور کے وسط میں پختہ سڑک کے قریب ہی غوری النسل لوگوں کی مشہور بستی لپری ان کا آبائی وطن تھا۔ ان کے بزرگ حضرت سلطان شاہ ٹانڈہ کے مشہور صاحب دل بزرگ حضرت چاند شاہ کے اجل خلفا میں تھے، جو نقشبندی سلسلے سے منسلک تھے اور فیض آباد ہی نہیں اعظم گڈھ، جونپور اور سلطانپور وغیرہ کے لوگوں کو بھی ان سے بڑا فیض پہنچا۔

لپری کا یہ خاندان علمی، دینی اور دنیاوی لحاظ سے فائق تھا۔ مولانا عثمان احمد قاسمی کے جد بزرگوار کے حسب ذیل تین صاحبزادے تھے، مولانا عبد الغفور صاحب، مولانا دین محمد صاحب، مولانا شاہ سعید احمد صاحب، موخر الذکر کے پانچوں بیٹے دینی تعلیم سے بہرہ ور ہوئے، ان میں بڑے مولانا جمیل احمد فخر خاندان تھے اور سب سے چھوٹے یہی مولانا عثمان احمد تھے، مولانا دین محمد صاحب بھی عالم، اچھے استاد اور نہایت باغ و بہار شخص تھے، یہ مولانا ابو العرفان ندوی سابق مہتمم دار العلوم ندوۃ العلماء کے پدر بزرگوار تھے، علم و دین کی اشاعت ان کی زندگی کا خاص مشغلہ تھا، جونپور کی اٹالہ مسجد کا مدرسہ ان کے اہتمام کے زمانے میں بڑی رونق پر تھا۔

مولانا دین محمد صاحب کی جد و جہد سے شاہ گنج کی جامع مسجد میں بھی ایک دینی مدرسہ بدر الاسلام کے نام سے قائم ہوا، جس کے وہی سارے انتظامات اور تعلیمی خدمات انجام دیتے رہے مگر جب ان کے برادر زادہ اور خویش مولانا جمیل احمد صاحب دار العلوم دیوبند سے فارغ التحصیل ہوئے تو مدرسہ کا اہتمام، تعلیمی نگرانی اور جامع مسجد کی امامت ان کے سپرد ہوگئی، اور مولانا دین محمد صاحب مدرسہ کے مالی استحکام کی طرف متوجہ ہوگئے، مولانا جمیل احمد نے اس علاقہ میں بڑی عزت، شہرت اور نیک نامی حاصل کی۔ ان کے اخلاص، عزم، استقلال، جوش عمل اور حسن تدبر کی وجہ سے مدرسہ کو بڑی ترقی ہوئی، ابھی تک مسجد ہی تعلیم گاہ کا کام دیتی تھی، انہوں نے اس کی شاندار دو منزلہ عمارت تعمیر کرائی اور متوسطات تک اسباق کا سلسلہ جاری کیا۔ ہر سال کئی کئی طالب علم دورۂ حدیث اور تکمیل کے لیے دار العلوم دیوبند جانے لگے۔

مولانا عثمان احمد کی ابتدائی تعلیم گھر پر ہوئی، پھر اسی مدرسہ میں داخل ہوکر اپنے برادر بزرگ مولانا جمیل احمد صاحب کی خاص نگرانی میں تعلیم و تربیت کے مراحل طے کیے اور ۱۹۵۴ء میں تکمیل کے لیے دار العلوم دیوبند تشریف لے گئے، اور مولانا حسین احمد مدنیؒ اور دوسرے مشہور اساتذہ سے کسب فیض کیا، مولانا جمیل احمد صاحب بھی حضرت مدنیؒ کے ارشد تلامذہ میں تھے اور ان سے بیعت بھی تھے، اس پورے خاندان کو ان سے بڑا انس اور خاص تعلق تھا۔ دار العلوم سے فراغت کے بعد مولانا عثمان احمد اپنے مربی اور سرپرست بھائی کی رہنمائی میں مدرسہ بدر الاسلام میں درس و تدریس کی خدمت انجام دینے لگے۔

۱۹۶۴ء میں مولانا جمیل احمد صاحب کے انتقال کے بعد ان کے چھوٹے اور مولانا عثمان کے بڑے بھائی مولانا احمد کو ان کی جانشینی کا شرف حاصل ہوا تو مولانا عثمان ان کے خاص دست و بازو بنے اور جب ان کا بھی انتقال ہوگیا تو مدرسہ کی ساری ذمہ داریاں مولانا عثمان کے

کاندھوں پر آگئیں، انھوں نے اپنی ہمت، جانفشانی اور تدبر سے مدرسہ کو بڑی خوش اسلوبی سے
چلایا اور اس کے رکھ رکھاؤ میں کسی طرح کا فرق نہیں آنے دیا۔ انھوں نے مدرسہ کو ترقی و استحکام
بھی بخشا اور فیض جمیل لائبریری کی تاسیس بھی کی، بازار میں علمی کتاب گھر قائم کیا تاکہ لوگوں کو
سستے دام پر کتابیں فراہم کرسکیں۔

مولانا جمیل احمد صاحب کے زمانے ہی سے مدرسہ میں علماء و مشائخ کی آمد و رفت
برابر رہتی تھی، دارالعلوم دیوبند اور جمعیۃ علمائے ہند کے اکثر اکابر یہاں تشریف لاتے رہتے ہیں
اور جن لوگوں کو آنے کا موقع نہ رہتا اور مولانا کو اطلاع ہوجاتی تو وہ خود اپنے اساتذہ و
طلبہ کو لے کر اسٹیشن پہونچ جاتے اور ملاقات کرتے، مولانا عثمان صاحب نے بھی اس
روایت کو برقرار رکھا، اس طرح مولانا حسین احمد مدنیؒ، مولانا قاری طیب، مولانا حفظ الرحمن
مولانا سید محمد میاں، مولانا اسعد مدنی وغیرہ سب یہاں تشریف لاچکے ہیں۔ مولانا سید
ابوالحسن علی ندوی مدظلہ بھی دارالمصنفین تشریف لاتے تو کچھ دیر مدرسہ میں قیام فرماتے
اور اب کئی برس سے پیرانہ سالی کی بنا پر یہاں استراحت فرمانا ان کا معمول ہوگیا ہے،
مولانا شاہ معین الدین احمد ندوی بھی اپنے وطن ردولی اور لکھنؤ وغیرہ جاتے آتے مدرسہ
میں قیام کرکے بڑا سکون محسوس کرتے، خود اس ناچیز کو بھی اس کا اتفاق کئی بار ہوا ہے۔

اخلاص، استغنا، سیرچشمی، مخلصانہ اور بے غرض خدمت اس خاندان کی نمایاں
خصوصیت تھی، مولانا عثمان احمد میں بھی یہ خوبیاں بدرجۂ اتم پائی جاتی تھیں، بڑے
مزاج شناس تھے، سب کے ساتھ حسب حال اچھا برتاؤ کرتے، فرق مراتب اور دوسروں کے
حقوق کا پاس و لحاظ رکھتے تھے، ان کے سب بھائیوں میں باہم جو خلوص، یگانگت، شیفتگی
اور سچی محبت تھی اس کے نمونے اب بالکل دیکھنے کو نہیں ملتے۔

شعر و سخن سے دلچسپی اور اس کا ستھرا ذوق بھی اس خاندان کا امتیاز تھا، مولانا جمیل احمد
صاحب کے بعد مولانا عثمان احمد میں یہ وصف زیادہ بڑھا ہوا تھا، انھوں نے بڑی موزوں
طبیعت پائی تھی، مختلف اصناف میں طبع آزمائی کرتے تھے۔ بات بات میں ارتجالاً نہایت
برمحل اور موقع کے مناسب شعر کہتے تھے، اساتذہ کے بکثرت اشعار یاد تھے اور دور جدید
کے شعراء کا کلام بھی ان کی نظر سے گزرتا رہتا تھا، اپنی مجلسوں کو قدیم و جدید شعراء کا
کلام سناکر زعفران زار بنا دیتے تھے۔ میں بھی ایک دفعہ رات کے کھانے میں شریک تھا،
کھانے کے درمیان اور اس کے بعد دیر تک شعر و شاعری کا سلسلہ چلتا رہا، وہ اشعار
سنانے کے ساتھ ہی ان کا پس منظر بھی بیان کرتے جاتے تھے، جنگ عظیم کے زمانے میں
اتحادیوں کی پسپائی سے خیال ہونے لگا تھا کہ ہندوستان بھی اب تب زد میں آجائے گا، اسی
موقع کا کہا ہوا نذیر بنارسی کا یہ شعر سنایا۔

برق گرے گرا کرے، چمن جلے جلا کرے　　جس کا چمن میں کچھ نہ ہو فکر چمن وہ کیا کرے

اردو نثر لکھنے کا اچھا سلیقہ تھا، اپنے برادر اکبر کے حالات و کمالات پر "ذکر جمیل" کے
نام سے ایک کتاب مرتب کی۔ ان کا مجموعہ کلام "فکر جمیل" کے نام سے شایع کیا، مدرسہ
بدرالاسلام کی تاریخ لکھی، گو ان کا سارا وقت درس و تدریس اور مدرسہ کے انصرام میں
صرف ہوتا تھا، تاہم لکھنے پڑھنے کا ذوق فطری تھا، چھوٹی بڑی ایک درجن سے زیادہ کتابیں
لکھیں جن میں بعض مکاتب کے نصاب میں داخل ہیں۔

دارالمصنفین سے والہانہ تعلق تھا، معارف کے بڑے قدرداں تھے، اس کا مطالعہ
پابندی سے کرتے، شاہ معین الدین احمد صاحب سے عقیدت مندانہ تعلق تھا، شاہ صاحب
بھی ان سے بڑے لطف و شفقت کا معاملہ فرماتے تھے، اس عاجز سے بھی بڑا گہرا تعلق تھا۔

اب عرصہ سے بیماری کی وجہ سے کہیں آنا جانا موقوف ہوگیا تھا تو اپنے عزیز شاگرد مولوی عبدالمعبود ندادان بستوی کو برابر بھیج کر تعلق و محبت کا اظہار فرماتے رہتے تھے، ڈیڑھ برس قبل ان پر شدید قلبی دورہ پڑا مجھے معلوم ہوا تو عیادت کے لیے حاضر ہوا، اُس وقت جس تپاک اور گرم جوشی سے ملے تھے اس کی یاد ابھی تک قائم ہے، میں نے اپنی بچی کے عقد میں بلایا تو بیماری کی وجہ سے خود نہیں تشریف لاسکے مگر اپنے ایک صاحبزادے کو بچی کے لیے مترجم قرآن مجید دے کر بھیجا۔

وہ تو چلے گئے، مگر لطف و محبت کی بے شمار یادیں چھوڑ گئے، اب عمر بھر یہی کہتے رہنا ہے۔

وہ صورتیں الٰہی کس دیس بستیاں ہیں   اب جن کے دیکھنے کو آنکھیں ترستیاں ہیں

پس ماندگان میں اہلیہ، تین صاحبزادے اور پانچ صاحبزادیاں ہیں، اللہ تعالیٰ ان سب کا غم زائل کرے اور مولانا کو ان کی نیکیوں اور خوبیوں کے سبب جنت الفردوس عطا کرے آمین!!

مولوی حافظ محمود خاں بھوپالی

یہ سطریں زیر تحریر ہی تھیں کہ دارالعلوم تاج المساجد کے استاد مولوی عبدالسبحان صاحب تشریف لائے، ان سے یہ معلوم کرکے سخت صدمہ ہوا کہ مولانا حافظ محمد نعمان خاں کے صاحبزادے اور مولانا حافظ محمد عمران خاں کے بھتیجے حافظ محمود خاں بھوپالی نے ۲۰ رمضان المبارک کو داعیِ اجل کو لبیک کہا، وہ ہمارے سابق رفیق مولوی حافظ محمد منصور نعمانی مرحوم کے حقیقی بھائی تھے، پہلے دارالعلوم کے کتبخانہ کے ناظر تھے اور اب اس کے نائب مہتمم اور ڈاکٹر محمد حسان خاں امیر دارالعلوم کے خاص دست و بازو ہوگئے تھے۔ اللہ تعالیٰ ان کی مغفرت فرمائے اور مولانا نعمان صاحب اور دوسرے اعزہ کو صبر جمیل عطا کرے آمین!

"ض"

مطبوعات جدیدہ

مضامین مقبول از جناب پروفیسر مقبول احمد، متوسط تقطیع، عمدہ کاغذ و طباعت، صفحات ۲۹۸، خوبصورت جلد، قیمت مجلد ۲۰۰ روپے۔ ....، پتہ: ڈاکٹر مقبول احمد ۹۔ رپن اسٹریٹ، کلکتہ ۷۰۰۰۱۶ اور مکتبہ جامعہ دہلی۔

اس مفید اور بامقصد مجموعہ مضامین کے مولف کلکتہ بلکہ عالمی شہرت کے مسیحا صفت معالج اور ماہر و حاذق طبیب اور نیل رتن میڈیکل کالج کے شعبۂ سرجری کے سابق پروفیسر ہیں تعلیم و تدریس اور پیشہ و فن میں شاندار کارکردگی کے علاوہ وہ امراض ملی و ملکی کی نشاندہی، علاج اور صحت و شفا کے لیے بھی سرگرم عمل رہتے ہیں، مسلم مجلس مشاورت اور دوسری تنظیموں اور اداروں سے ان کا رشتۂ تعاون و اخلاص قائم و استوار ہے، وہ وقتاً فوقتاً ملک و ملت کو درپیش مسائل کے متعلق اپنے قلم کے ذریعہ اظہار خیال کرتے رہتے ہیں، کلکتہ کے مشہور روزنامہ آزاد ہند کے علاوہ ملک کے اور رسائل میں ان کے مضامین شایع ہوتے ہیں، اخلاص و صداقت، دوربینی و دقیقہ رسی اور دل کی بیقراری و دردمندی کی خوبیاں ان کی تحریروں میں خاص اثر پیدا کرتی ہیں، زیر نظر کتاب میں ان بکھرے ہوئے موتیوں کو مختلف ابواب و عنوانات مثلاً مذہبیات، دنیائے اسلام اور مغرب، ہندوستانی مسلمانوں کے مسائل، تعلیم و تربیت، اصلاح معاشرہ، سائنس اور طنز و مزاح کی لڑیوں میں پرو دیا گیا ہے شروع میں مدیر معارف کے علاوہ پروفیسر خلیق احمد نظامی مرحوم اور پروفیسر نسیم انصاری کی تعارفی تحریروں سے کتاب کی قدر و قیمت و افادیت کا اندازہ ہوتا ہے توقع ہے کہ اپنے نام کے مانند کتاب کو عام مقبولیت حاصل ہوگی، یہ مکتبہ دارالمصنفین سے بھی حاصل کی جاسکتی ہے۔

حضرت ولید بن عقبہؓ (مودودی صاحب کی نظر میں) از جناب مولانا محمد محی الدین فتحپوری، چھوٹی تقطیع، عمدہ کاغذ و کتابت و طباعت، صفحات ۱۵۲، قیمت ۱۲ روپے، پتہ: مکتبہ البدر، کاکوری، لکھنؤ، ۲۲۷۱۰۷۔

مولانا ابوالاعلیٰ مودودی کی کتاب خلافت و ملوکیت کے بعض مضامین و خیالات کے رد میں چھوٹی بڑی متعدد کتابیں لکھی گئیں، یہ کتاب بھی اسی سلسلہ کی ایک کڑی ہے جس میں مکمل کتاب کے بجائے، اس کے صرف ایسے گوشے کا جائزہ لیا گیا ہے جو تفصیل و اہمیت کا متقاضی تھا، فاضل مصنف کی نظر میں حضرت ولید بن عقبہؓ ان چند صحابہ کرام میں ہیں جن کو صاحب خلافت و ملوکیت نے خلاف واقعہ الزامات کے ذریعہ ہدف تنقید بنایا اور نامناسب لب و لہجہ اختیار کیا، چنانچہ انھوں نے بڑے متین و سنجیدہ انداز میں ان الزامات کا علمی و تحقیقی و تاریخی تجزیہ کیا، حضرت ولید بن عقبہؓ کے مفصل عذر بھی فراہم کیے، ایک صحابی رسولؐ کی برأت کی یہ کامیاب سعی یقیناً مبارک و مستحسن ہے۔

عبادالرحمٰن از جناب مولانا محمد خالد القاسمی، کتابت و طباعت مناسب، صفحات ۴۰، قیمت ۱۰ روپے، پتہ: مدرسہ اسلامیہ عربیہ سراج العلوم، حشمت پیٹھ، سکندرآباد، اے پی۔

سورۃ الفرقان کی آخری آیات میں عبادالرحمٰن کے اوصاف و محاسن بیان کیے گئے ہیں، اس رسالہ میں ان کی تشریح آسان و دلنشیں انداز میں کی گئی ہے، مقصد یہ ہے کہ ان صفات و خصوصیات کے ذکر سے مسلمانوں کی زندگی میں انقلاب آئے اور وہ اللہ تعالیٰ کی رضا و مغفرت کے مستحق ہوں، کتاب کے مولف حیدرآباد دکن کے نیک نام عالم و خطیب ہیں اور اپنی موثر تقریروں کے لیے معروف ہیں، اس رسالہ میں بھی ایک خاص اثر ہے۔

ع۔ص۔